جمادی الاولیٰ ۱۴۳۶ھ
مارچ ۲۰۱۵ء

ماہنامہ میثاق لاہور

از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

وجوبِ التزامِ سُنّت (مطالعہ حدیث)
بانیٔ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اسلام اور ریاست
اصحابِ علم وفضل کی جوابی تحریریں

داعیٔ رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیمِ اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
(نواں ایڈیشن) —— صفحات:360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
(چھٹا ایڈیشن) —— صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
(پانچواں ایڈیشن) —— صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
(چوتھا ایڈیشن) —— صفحات 394، قیمت 475 روپے

حصہ پنجم سُورۃ مریم تا سُورۃ السّجدۃ
(تیسرا ایڈیشن) —— صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سُورۃ الاحزاب تا سُورۃ الحجرات
(دوسرا ایڈیشن) —— صفحات 484، قیمت 590 روپے

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
18-A ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر2، شعبہ بازار پشاور، فون: (091)2584824,2214495

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ: ۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 64

شمارہ : 3

جُمادی الاُولیٰ 1436ھ

مارچ 2015ء

فی شمارہ 30/-

مُدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

❁ اندرون ملک 300 روپے

❁ بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے

❁ ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ 1200 روپے

❁ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور

فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36313131

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

❁ **عرضِ احوال** 5

فرقہ وارانہ دہشت گردی:
پشتیبان کون اور کیوں؟

ایوب بیگ مرزا

❁ **بیانُ القُرآن** 9

سورۃ طٰہٰ (آیات ۱ تا ۵۵)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

❁ **مطالعۂ حدیث** 23

وجوبِ التزامِ سُنّت

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

❁ **توضیح وتنقیح** 55

☆ اسلام اور ریاست — مفتی محمد تقی عثمانی 55

☆ اسلام اور ریاست — ابتسام الٰہی ظہیر 63

☆ اسلام اور ریاست — ڈاکٹر حافظ محمد زبیر 69

☆ مسلم وحدت:
مابین فقہائے اسلام و غامدی — حامد کمال الدین 85

☆ پارلیمنٹ کے فیصلوں سے انکار کیوں؟ — انصار عباسی 95

❁❁❁

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

فرقہ وارانہ دہشت گردی: پشتیبان کون اور کیوں؟

اگرچہ نائن الیون کے بعد پاکستان مسلسل دہشت گردی کا شکار ہے' لیکن کچھ عرصہ سے باقاعدہ ایک ہدف کا تعین کر کے پاکستان میں دہشت گردی کا ارتکاب ہو رہا ہے' اور وہ ہدف ہے اہلِ تشیع اور اہلِ سُنّت کے درمیان فرقہ واریت کی آگ بھڑکانا۔ ایک طرف امام بارگاہوں پر حملے کر کے عبادت میں مصروف اہل تشیع کو ہلاک کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اہل سنت علماء فرداً فرداً ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ یہ منصوبہ بندی کوئی عام جہادی گروپ یا فرقہ پرست گروہ کر سکتا ہے۔ یہ اس گریٹ گیم کا حصہ ہے جو بعض عالمی قوتیں عالمی سطح پر اور اس خطہ میں خاص طور پر کھیل رہی ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں بڑے بڑے پولیٹکل فلاسفر تھنک ٹینکس کے ذریعے اپنی حکومتوں کو مشورے دے رہے ہیں کہ خطے میں وہ اپنے مفادات کا تحفظ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اسی طرح کا کھیل امریکہ اور برطانیہ مل کر عراق میں کھیل چکے ہیں۔ عراق میں اہلِ تشیع کی اکثریت تھی لیکن وہاں کے حکمران صدام حسین کا تعلق اہل سنت سے تھا۔ صدام حسین ایک ظالم حکمران تھا' لیکن اس کے ظلم وستم کی بنیاد مذہب یا مسلک نہیں تھا بلکہ صرف اپنے اقتدار کا تحفظ اور استحکام تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ صدام کے دور میں خوفناک سیاسی حبس تھا' حکومت کے خلاف کوئی آواز نہیں نکال سکتا تھا' لوگ کسی اجنبی کے سامنے زبان نہیں کھولتے تھے' لیکن عوام کو زندگی کی تمام ضروریات بآسانی اور بسہولت میسر تھیں۔ حکومت لوگوں کو بنیادی ضروریات بڑی ذمہ داری سے فراہم کرتی تھی۔ آج عراقی عوام کی اکثریت بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہے اور اس کی جغرافیائی تقسیم کا بھی قوی امکان ہے۔ عراق میں امریکہ نے یہ سٹرٹیجی اختیار کی کہ پہلے WMD کا افسانہ گھڑا اور عراق پر حملہ کر دیا' پھر عراق کی عوام کو تقسیم کرنے کے لیے یہی طریقہ واردات اختیار کیا کہ کبھی اہلِ تشیع کی زیارت گاہوں اور امام بارگاہوں پر حملے کرائے تو کبھی اہلِ سنت کی مساجد میں بم دھماکے کرا دیے۔

میثاق کے قارئین کو یاد ہوگا کہ بغداد میں برطانوی فوجیوں کی ایک گاڑی پکڑی گئی تھی۔ ان فوجیوں نے عربوں کا لباس پہنا ہوا تھا اور وہ گاڑی میں بارود بھر کر ایک امام بارگاہ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ عراقی پولیس نے انہیں عرب سمجھ کر روکا اور بارود برآمد کر لیا اور گاڑی فوجیوں سمیت

تھانہ میں بند کر دی۔ بعد ازاں برطانوی فوج کے کچھ سپاہیوں نے اس تھانہ پر حملہ کیا اور اپنے ساتھی چھڑوا کر لے گئے تھے۔ عراق آج اہلِ تشیع اور اہلِ سنت کے درمیان میدانِ جنگ بنا ہوا ہے اور دونوں طرف سے مسلمان ہلاک ہو رہے ہیں۔ یہی کھیل پاکستان میں کھیلا جا رہا ہے۔ عراق میں یہ سب کچھ اسرائیل کے تحفظ کے لیے کیا گیا ہے۔ اسی طرح امریکہ اور یورپ کو کسی اسلامی ملک کا ایٹمی صلاحیت کا مالک بننا کسی صورت قابل قبول نہیں۔ پاکستان کی ایٹمی قوت سے خود امریکہ اور یورپ کو تو کوئی خطرہ نہیں لیکن ان کے لے پالک بچے اسرائیل کی سلامتی خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ امریکہ ایک سے زائد بار یہ واضح اعلان کر چکا ہے کہ اسرائیل کی سلامتی کا تحفظ امریکہ کی خارجہ پالیسی کا بنیادی پتھر ہے۔ نائن الیون کی آڑ میں جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تھا اس وقت بھی اسرائیل کی بڑی خواہش تھی کہ پاکستان کو بھی اس حملہ کی لپیٹ میں لے کر اس کی ایٹمی صلاحیت کو تباہ کر دیا جائے' لیکن امریکہ کی بھی کچھ اپنی مجبوریاں تھیں۔ لہٰذا پاکستان پر کھلم کھلا حملہ کرنے سے گریز کیا گیا' البتہ گیم یہ ہے کہ مختلف سازشوں کے ذریعے' جس میں دہشت گردی کی یہ لعنت بھی شامل ہے' پاکستان کا قافیہ اتنا تنگ کر دیا جائے کہ پاکستان لیبیا کی طرح اپنی ایٹمی صلاحیت پلیٹ میں رکھ کر امریکہ اور اس کے حواریوں کو پیش کر دے۔

جنوبی ایشیا میں امریکہ کے مفادات سیاسی' تجارتی اور عسکری نکتہ نظر سے بہت اہم ہیں۔ اولاً یہ کہ چین کی اقتصادی صورتِ حال اور معیشت ناقابل یقین حد تک مضبوط ہو چکی ہے' گویا چین ایک معاشی جن بن چکا ہے' عسکری سطح پر وہ جلد ہی عالمی قوتوں کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں آ جائے گا' لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ امریکہ کو خوف ہے کہ چین اس کی عالمی بادشاہت کو چیلنج کرنے والا ہے' لہٰذا پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ اسے انتہائی کمزور کر کے مجبور کر دیا جائے کہ وہ چین کے محاصرے کی امریکی پالیسی کا حصہ بن کر اور بھارت کے جونیئر پارٹنر کی حیثیت سے چین کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا حصہ بن جائے۔ چنانچہ پاکستان کو یہ کردار قبول کرنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔

پاکستان کے خلاف سازشوں کا بازار گرم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امریکہ و یورپ اور اسرائیل یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عالمی بادشاہت کا انحصار سرمایہ دارانہ نظام میں ہے' اسی لیے پہلے عالمِ اسلام کو مذہب کا واسطہ دے کر کمیونزم کے خلاف استعمال کیا اور بڑی خوبصورتی سے کیا' اور ستر سال کے قلیل عرصہ میں کمیونزم اپنے انجام کو پہنچ گیا' کیونکہ اسی نظام نے مزدوروں کے حقوق اور مزدوروں کی حکومت کے نام پر سرمایہ دارانہ نظام کو چیلنج کیا تھا۔ امریکہ نے عالمِ اسلام خصوصاً پاکستان کی مدد کے ساتھ اس نظام کے کسٹوڈین سوویت یونین کو شکست وریخت سے دوچار کر دیا

جس سے کمیونزم گھٹنوں کے بل آن گرا اور وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

اس حوالہ سے اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ امریکہ جانتا ہے کہ اگرچہ ستاون اسلامی ممالک میں سے کسی ایک ملک میں بھی اسلامی نظام رائج نہیں ہے اور اس حوالہ سے اس کے سرمایہ دارانہ نظام کو کوئی خطرہ نہیں لیکن وہ یہ بات اس سے بھی زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے کہ اسلامی نظام غیر استحصالی ہونے کی وجہ سے اور فلاحِ انسانیت کا بھرپور میکنزم رکھنے کی وجہ سے انتہائی پرکشش نظام ہے' لہٰذا کسی وقت بھی دنیا سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی ہتھکنڈوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ مسلمانانِ پاکستان عملی لحاظ سے اسلام سے کوسوں دور ہیں' بددیانتی عام ہے' اکثریت نے پیسہ کو معبود بنایا ہوا ہے' سود نے معیشت کو اور فحاشی و بے حیائی نے معاشرت کو تباہ کر رکھا ہے' لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہو گا کہ مسلمانانِ پاکستان بے عمل ہونے کے باوجود اسلام کے ساتھ گہرا جذباتی تعلق رکھتے ہیں اور وہ ۱۹۷۴ء کی اینٹی قادیانیت تحریک اور ۱۹۷۷ء کی نظامِ مصطفیٰ ﷺ تحریک میں اپنے ان اسلامی جذبات کا زوردار انداز میں اظہار کر چکے ہیں۔ پھر یہ کہ امریکہ اور یورپ پاکستان میں 295/C یعنی توہین رسالت پر موت کی سزا کے قانون کو ختم کروانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہیں اور ہمارے موجودہ و سابقہ حکمرانوں کا ریکارڈ یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کے آگے لب کشائی کی کوشش بھی نہیں کرتے بلکہ ''اچھے بچوں'' کی طرح ان کے حکم اور بعض اوقات محض ان کی خواہش اور تجویز پر' فرمانبرداری بجالاتے ہوئے عمل درآمد کر گزرتے ہیں' چاہے یہ عمل قومی سطح پر کتنا ہی ضرر رساں کیوں نہ ہو' لیکن توہین رسالت قانون کے حوالہ سے ہمارے حکمران عوام کے تیور دیکھ چکے ہیں لہٰذا وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آقاؤں کے اس حکم کی تعمیل نہیں کر سکے' کیونکہ اس حوالہ سے عوام کے جذبات میں بڑی شدت ہے۔ امریکہ سمجھتا ہے کہ اسلام سے یہ جذباتی تعلق مسلمانانِ پاکستان کے قلوب و اذہان میں کسی وقت بھی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے اور وہ حقیقی مسلمان بن سکتے ہیں' لہٰذا مذکورہ دہشت گردی سے وہ مذہبی منافرت پیدا کرنا چاہتا ہے اور دہشت گردی کا الزام مذہبی تحریکوں پر لگا کر انہیں عوام سے دور کرنا چاہتا ہے۔

مزید برآں امریکہ کو یہ گمان ہے کہ کمزور اور غیر مستحکم پاکستان اگر کبھی حقیقی اسلام کی طرف بڑھتا ہی ہے یا یہاں اسلامی انقلاب وقوع پذیر ہو بھی جاتا ہے تو جلد ہی انقلاب مخالف تحریکوں کی مدد سے اسے ناکام بنایا جا سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ ہمارے سیکولر میڈیا' سیکولر جماعتوں اور سیکولر دانشوروں پر ازحد مہربان نظر آتا ہے۔ این جی اوز کی ایک بہت بڑی تعداد پاکستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ اسلام دشمن اور پاکستان دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں'

لیکن حکومت ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر رہی' کیونکہ اسلام دشمن عالمی قوتیں ان کی پشتیبان ہیں۔ حالانکہ محبِّ وطن عناصر بارہا یہ مسئلہ حکمرانوں کے سامنے اٹھا چکے ہیں کہ ان این جی اوز کو غیر ممالک سے کثیر فنڈنگ ہو رہی ہے' ان کی مانیٹرنگ کی جائے' لیکن اہل اقتدار ٹس سے مس نہیں ہو رہے۔ قصہ کوتاہ امریکہ یہ سمجھتا ہے کہ اسلامی ممالک میں افغانستان کے بعد پاکستان ہی ایسا ملک ہے جہاں اسلامی نظام کے لیے مؤثر تحریک برپا ہو سکتی ہے' لہٰذا افغانستان کی امارتِ اسلامیہ کو تو نائن الیون کی آڑ میں کھلی جارحیت کر کے تباہ و برباد کر ڈالا اور اب پاکستان کو دہشت گردی کی زد میں لا کر عدم استحکام سے دوچار کر رہے ہیں۔ ہدف ایک ہی ہے کہ کسی بھی ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ کاٹ دینے والا نظام قائم نہ ہو سکے۔ پاکستان کو کمزور اور غیر مستحکم کرنا اس لیے بھی ضروری سمجھا جا رہا ہے تاکہ وہ افغانستان میں کوئی اہم رول ادا کرنے کے قابل نہ رہے اور بھارت افغانستان کی سیکولر حکومت کو مضبوط کر کے مستقبل میں افغان طالبان کی حکومت کے قیام کو روک سکے۔

ہم عرصہ سے مسلمانانِ پاکستان کے ذہن و قلب میں مثبت انداز سے یہ بات راسخ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستان کا استحکام ہی نہیں اس کی بقا اور سلامتی کا انحصار بھی اسلامی نظام کے نفاذ پر ہے۔ کاش ہمارے ہم وطن منفی انداز ہی میں اس بات کو سمجھ لیں کہ آخر یہود و نصاریٰ پاکستان میں اسلامی نظام کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور کیوں لگا رہے ہیں؟ امریکہ اور یورپ کی یہ حکومتیں اپنے عوام کی ٹیکس کی مد میں جمع شدہ رقوم کے حوالہ سے بڑی حساس ہوتی ہیں اور انہیں انتہائی احتیاط اور فکرمندی سے خرچ کرتی ہیں۔ آخر پاکستان میں نظامِ اسلام کا راستہ روکنے کے لیے یہ حکومتیں بے دریغ سرمایہ کیوں خرچ کر رہی ہیں؟ درحقیقت انہیں سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ مقصود و مطلوب ہے جو ان کی عالمی بادشاہت قائم و دائم رکھنے کی واحد بنیاد ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ایسا نظام ہے جس سے ایک فیصد ننانوے (۹۹) فیصد کے وسائل کو ہڑپ کر رہا ہے۔ اس ننانوے فیصد کی حیثیت ڈھور ڈنگر سے بڑھ کر نہیں جو ایک فیصد کی خدمت کے لیے دن رات کولھو کے بیل کی طرح سر نیچے کیے چکر کاٹ رہا ہے۔ یہ صرف اسلامی نظام ہی ہے جو انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال سکتا ہے' لہٰذا آج اقامت دین کی جدوجہد افضل ترین جہاد ہے جو ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے مسلمانانِ پاکستان کو صف اول میں آنا ہو گا اور امتِ مسلمہ کا ہراول دستہ بننا ہو گا' کیونکہ عالمِ اسلام میں پاکستان واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر بنا تھا اور اسلام ہی اس کے قیام کا جواز ہے۔ اسی صورت میں مسلمانانِ پاکستان دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکیں گے۔

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ طٰہٰ

تمہیدی کلمات

سورۂ مریم کے آغاز میں تمہیدی کلمات کے تحت تین سورتوں (مریم‘ طٰہٰ اور الانبیاء) پر مشتمل اس ذیلی گروپ کا تعارف ہو چکا ہے‘ جس کی دوسری سورت سورۂ طٰہٰ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آیات ۱ تا ۸

طٰہٰ ﴿۱﴾ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ﴿۲﴾ اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ﴿۳﴾ تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ﴿۴﴾ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی ﴿۵﴾ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا وَ مَا تَحۡتَ الثَّرٰی ﴿۶﴾ وَ اِنۡ تَجۡہَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّہٗ یَعۡلَمُ السِّرَّ وَ اَخۡفَی ﴿۷﴾ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ لَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ﴿۸﴾

آیت ۱ ﴿طٰہٰ ۱﴾ ’’طٰہٰ!‘‘

آیت ۲ ﴿مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ۲﴾ ’’ہم نے آپؐ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپؐ مشقت میں پڑیں۔‘‘

آپؐ کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچا دینے کی حد تک ہے۔ اب اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے تو آپؐ ان کے پیچھے خود کو ہلکان نہ کریں۔ یہی مضمون اس سے پہلے سورۃ الکہف میں اس

طرح آ چکا ہے: ﴿فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِہِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا ۶﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) آپ شاید اپنے آپ کو غم سے ہلاک کر لیں گے ان کے پیچھے‘ اگر وہ ایمان نہ لائے اس بات (قرآن) پر‘‘۔ سورۃ الشعراء میں بھی فرمایا گیا: ﴿لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ اَلَّا یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ۳﴾ ’’شاید کہ آپؐ ہلاک کر ڈالیں اپنے آپ کو (اس وجہ سے) کہ وہ ایمان نہیں لا رہے‘‘۔ بہر حال یہ تو اس آیت کا وہ ترجمہ اور مفہوم ہے جو عمومی طور پر اختیار کیا گیا ہے‘ لیکن میرے نزدیک اس کا زیادہ بہتر مفہوم یہ ہے کہ اے نبی ﷺ! ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپؐ ناکام ہوں۔ اس لیے کہ شَقِیَ یَشْقٰی کے معنی ناکام و نامراد ہونے کے ہیں۔

عربی زبان کے بہت سے مادے ایسے ہیں جن کے حروف کی آپس میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ’’ر ب ب‘‘ مادہ سے رَبَّ یَرُبُّ کا معنی ہے: مالک ہونا‘ انتظام کرنا۔ اس سے لفظ ’’رب‘‘ بنا ہے۔ ’’ر ب و‘‘ سے رَبَا یَرْبُوْ رَبْوًا کا مفہوم ہے: (مال) زیادہ ہونا‘ بڑھنا۔ اس سے ربا (سود) مستعمل ہے۔ جبکہ ’’ر ب ی‘‘ سے رَبَّی یُرَبِّیْ تَرْبِیَۃً کا معنی و مراد ہے: پرورش کرنا‘ نشوونما دینا۔ ان مادوں کے معنی اگرچہ الگ الگ ہیں مگر حروف کے اشتراک کی وجہ سے ان میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ’’ش ق ی‘‘ اور ’’ش ق ق‘‘ بھی دو مختلف المعانی لیکن باہم مشابہ مادے ہیں۔ ایسے مشابہ مادوں سے مشتق اکثر اَسماء و افعال بھی باہم مشابہ ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے بہت سے الفاظ ذو معنی بھی قرار پاتے ہیں۔ چنانچہ تَشْقٰی کو اگر ’’ش ق ق‘‘ سے مشتق مانا جائے تو اس کے معنی مشقت اور محنت کے ہوں گے اور اگر اس کا تعلق ’’ش ق ی‘‘ سے تسلیم کیا جائے تو معنی ناکامی و نامرادی کے ہوں گے۔ یہاں اگر اس لفظ کا دوسرا ترجمہ مراد لیا جائے تو یہ آیت حضور ﷺ کے لیے گویا ایک بہت بڑی خوشخبری ہے کہ اے نبیؐ یہ قرآن قولِ فیصل بن کر نازل ہوا ہے‘ لہٰذا آپؐ کے اس مشن میں ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عنقریب کامیابی آپؐ کے قدم چومے گی۔

آیت ۳ ﴿اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ۳﴾ ’’یہ تو صرف یاددہانی ہے اُس کے لیے جو ڈرتا ہے۔‘‘

یعنی جن کے دلوں میں کچھ خوفِ خدا ہے اُن کے لیے یہ نصیحت ہے۔

آیت ۴ ﴿تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ۴﴾ ’’اس کی تنزیل اُس

ہستی کی طرف سے ہے جس نے پیدا کیا زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔‘‘

آیت ۵ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵﴾ ’’(یعنی) رحمٰن! جو عرش پر متمکّن ہے۔‘‘

آیت ۶ ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶﴾ ’’اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے‘ جو کچھ زمین میں ہے‘ جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اور جو کچھ زمین کے سب سے نچلے طبقے کے نیچے ہے۔‘‘

الثَّـــرٰی کے معنی گیلی مٹی کے ہیں‘ یعنی گیلی مٹی کے نیچے بھی جو کچھ ہے وہ بھی اللہ ہی کی ملکیت ہے۔

آیت ۷ ﴿وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ﴾ ’’اور اگر تم بلند آواز سے کوئی بات کرو‘‘

اللہ کو پکارتے ہوئے‘ اس سے دعا یا مناجات کرتے ہوئے اگر تم لوگ اپنی آوازوں کو بلند کرو یا آہستہ رکھو‘ اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا:

﴿فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفَى ۝۷﴾ ’’وہ تو یقیناً جانتا ہے چھپی بات کو بھی اور نہایت مخفی بات کو بھی۔‘‘

آیت ۸ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۝۸﴾ ’’وہ اللہ ہے! اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ اُسی کے ہیں تمام اچھے نام۔‘‘

اب یہاں سے آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ شروع ہو رہا ہے جس کے بارے میں بیشتر تفصیلات سورۃ الاعراف کے مطالعے کے دوران گزر چکی ہیں۔ چنانچہ یہاں وہ تفصیلات پھر سے دہرائی نہیں جائیں گی۔

آیات ۹ تا ۲۴

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۹ اِذْ رَاَا نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ
نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝۱۰ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ
يٰمُوْسٰى ۝۱۱ اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۲
وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝۱۳ اِنَّنِىْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ
وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝۱۴ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى

كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝۱۵ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ
فَتَرْدٰى ۝۱۶ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ۝۱۷ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا
وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰي غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ۝۱۸ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ۝۱۹
فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝۲۰ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۣ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا
الْاُوْلٰى ۝۲۱ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ اٰيَةً
اُخْرٰى ۝۲۲ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرَى ۝۲۳ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۲۴

آیت ۹ ﴿وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۹﴾ ’’اور کیا آپؐ تک پہنچی ہے موسیٰؑ کی خبر؟‘‘

آیت ۱۰ ﴿اِذْ رَاَا نَارًا﴾ ’’جب اُس نے ایک آگ دیکھی‘‘

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ کے ساتھ مدین سے مصر کی طرف واپس آ رہے تھے۔ اندھیری رات تھی‘ سردی کا موسم تھا اور راستے کے بارے میں بھی ان کے پاس یقینی معلومات نہیں تھیں۔ اس صورتِ حال میں جب آپؑ کو آگ نظر آئی ہو گی تو یقیناً آپؑ بہت خوش ہوئے ہوں گے۔

﴿فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا﴾ ’’تو اُسؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ آپ ذرا (یہاں) ٹھہریئے‘ مجھے آگ نظر آئی ہے‘‘

﴿لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝۱۰﴾ ’’تاکہ میں لے آؤں تمہارے لیے اس میں سے کوئی انگارہ‘ یا میں پاؤں اس آگ (کی جگہ) سے کوئی راہنمائی۔‘‘

ممکن ہے مجھے وہاں سے کوئی چنگاری مل جائے جس کی مدد سے ہم آگ جلا کر تاپ سکیں‘ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں سے مجھے راستے کے بارے میں کوئی راہنمائی مل جائے۔ ایسا نہ ہو کہ رات کے اندھیرے میں ہم کسی غلط راستے پر چلتے رہیں۔

آیت ۱۱ ﴿فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝۱۱﴾ ’’پھر جب وہ آیا اس (آگ) کے پاس تو ندا دی گئی: اے موسیٰ!‘‘

آیت ۱۲ ﴿اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ﴾ ’’یہ تو میں تمہارا پروردگار ہوں‘‘

یعنی جسے تم آگ سمجھ کر یہاں آئے ہو اس آگ کے پردے میں خود میں ہوں‘ تمہارا رب‘ تمہارا پروردگار!

﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾﴾ ’’چنانچہ اپنی جوتیاں اتار دو‘ کیونکہ اس وقت تم مقدس وادی ’طویٰ‘ میں ہو۔‘‘

آیت ۱۳ ﴿وَاَنَا اخْتَرْتُكَ﴾ ’’اور میں نے تم کو چُن لیا ہے‘‘

میں نے آپؑ کو اپنے رسول کے طور پر پسند کر لیا ہے اور ایک بڑے مشن کے لیے آپؑ کا انتخاب کر لیا ہے۔

﴿فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾﴾ ’’تو اب ذرا توجہ سے سنو جو وحی تم پر کی جا رہی ہے۔‘‘

آیت ۱۴ ﴿اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا﴾ ’’یقیناً میں ہی اللہ ہوں! کوئی اور معبود نہیں سوائے میرے‘‘

یہ آیت اس لحاظ سے ممتاز و منفرد ہے کہ اللہ کی انانیت (انانیتِ کبریٰ) کے اظہار کے لیے جو الفاظ یہاں اس مقام پر استعمال ہوئے ہیں‘ میرے علم کی حد تک قرآن میں کسی اور مقام پر نہیں ہوئے۔ علامہ اقبال نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ایک تو ہماری انائے صغیر (The finite ego) ہے اور اس کے مقابلے میں اللہ کی انائے کبیر (The Infinite Ego) ہے۔ اس انائے کبیر (The Great I am) کا اس آیت میں بھرپور انداز میں اظہار ہوا ہے۔

﴿فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾﴾ ’’پس تم میری ہی بندگی کرو‘ اور نماز قائم رکھو میری یاد کے لیے۔‘‘

آیت ۱۵ ﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ ۢ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾﴾ ’’(اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ) بے شک قیامت آ کر رہے گی‘ میں اسے مخفی ہی رکھوں گا تاکہ بدلہ دیا جائے ہر جان کو جو اُس نے کوشش کی ہو۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾﴾ ’’تو (دیکھنا کہیں) تمہیں اس سے روگرداں نہ کر دے کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں رکھتا اور جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے‘ (اگر ایسا ہوا) تو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔‘‘

عَنْهَا کی ضمیر کا تعلق السَّاعَة (قیامت) سے بھی ہو سکتا ہے اور الصَّلٰوة (نماز) سے بھی۔ چنانچہ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ آخرت کا منکر کوئی شخص آپؑ کو بھی اس سے برگشتہ نہ کر دے۔ لیکن اگر عَنْهَا کا تعلق الصَّلٰوة سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص نماز کا منکر ہے تو وہ آپ کو بھی اس سے بدظن کرنے کا باعث نہ بن جائے۔

آیت ۱۷ ﴿وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾﴾ ’’اور اے موسیٰؑ! یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟‘‘

آیت ۱۸ ﴿قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ﴾ ’’کہا: یہ میرا عصا ہے!‘‘

بظاہر عصا کے بارے میں سوال کا بس یہی جواب کافی تھا‘ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سلسلے میں زیادہ تفصیل بیان کر دی۔ زیادہ تر مفسرین کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے مخاطبت اور مکالمے کے شوق و ذوق میں اپنی بات کو بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ آپؑ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے عرض کیا:

﴿اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾﴾ ’’میں اس پر ٹیک بھی لگا لیتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے (درختوں سے) پتے بھی جھاڑ لیتا ہوں‘ اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی کام ہوتے ہیں۔‘‘

آیت ۱۹ ﴿قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾﴾ ’’فرمایا: اے موسیٰؑ اس کو ذرا پھینکو تو سہی!‘‘

آیت ۲۰ ﴿فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾﴾ ’’تو اُس نے اسے پھینک دیا تو وہ دفعتاً ایک سانپ بن گیا دوڑتا ہوا۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫﴾ ’’فرمایا: اس کو پکڑ لو اور ڈرو نہیں!‘‘

سورۃ النمل (آیت ۱۰) اور سورۃ القصص (آیت ۳۱) میں اس واقعہ کے حوالے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خوفزدہ ہو جانے کا ذکر بھی آیا ہے: ﴿فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ﴾ ’’تو جب اُس نے دیکھا کہ وہ (لاٹھی) حرکت کر رہی ہے جیسے کہ وہ ایک سانپ ہو‘ تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا‘‘۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ موسیٰ‘ ڈرو نہیں‘ بلکہ آگے آؤ اور اس کو پکڑ لو۔ بہرحال یہاں پر وہ تفصیل بیان نہیں ہوئی۔

﴿سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾﴾ ’’ابھی ہم اس کو لوٹا دیں گے اس کی پہلی حالت پر۔‘‘

آیت ۲۲ ﴿وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾﴾ ''اور ذرا اپنا ہاتھ ملاؤ اپنی بغل کے ساتھ، وہ نکلے گا چمکتا ہوا بغیر کسی بیماری کے، یہ دوسری نشانی ہے۔''

آیت ۲۳ ﴿لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرَى ﴿۲۳﴾﴾ ''تاکہ ہم اپنی بڑی نشانیوں میں سے کچھ نشانیاں تمہیں دکھائیں۔''

آیت ۲۴ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾﴾ ''اب تم جاؤ فرعون کی طرف، وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔''

فرعون کی سرکشی اب حد سے تجاوز کر رہی ہے۔ چنانچہ آپؑ جائیں اور اسے بھلائی اور دین حق کی دعوت دیں۔ اسے یہ بھی کہیں کہ وہ بنی اسرائیل پر ظلم نہ کرے اور انہیں واپس اپنے وطن فلسطین جانے کی اجازت دے دے۔

آیات ۲۵ تا ۵۵

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ
لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾
اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذْكُرَكَ
كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿۳۵﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ
مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰى ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿۳۸﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي
التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ
لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ
فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۭ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا
وَلَا تَحْزَنَ ۭ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۭ فَلَبِثْتَ
سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰي قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ
لِنَفْسِيْ ﴿۴۱﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى
فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ
مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ۡ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ
اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾
قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ
هَدٰى ﴿۵۰﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا
يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ
فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ
شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾ مِنْهَا
خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

آیت ۲۵ ﴿قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾﴾ ''موسیٰؑ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میرے لیے میرے سینے کو کھول دے۔''

یہ بہت اہم دعا ہے اور یہ ہر اُس شخص کو یاد ہونی چاہیے جو دین کی دعوت کا مشن لے کر نکلا ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! تو نے جو عظیم الشان مشن میرے حوالے کیا ہے اس کے لیے اپنی خصوصی مدد میرے شامل حال کر دے اور اس کام کے لیے میرے سینے کو کھول دے۔

آیت ۲۶ ﴿وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۶﴾﴾ ''اور میرے اس کام کو میرے لیے آسان کر دے۔''

آیت ۲۷ ﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿۲۷﴾﴾ ''اور میری زبان کی گرہ (لکنت) کو کھول دے۔''

آیت ۲۸ ﴿يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾﴾ ''(تاکہ) میری بات کو وہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔''

ظاہر ہے لکنت والے شخص کی گفتگو کو سمجھنے میں لوگ دقت محسوس کرتے ہیں۔

آیت ۲۹ ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور میرے لیے ایک وزیر بھی بنا دے میرے خاندان میں سے۔''

لفظ ''وزیر'' کا مادہ وزر (بوجھ) ہے۔ اس لحاظ سے اس کے معنی ہیں: بوجھ اٹھانے والا۔

یعنی ذمہ داریوں میں مدد کرنے اور سہارا بننے والا۔

آیت ۳۰ ﴿هٰرُوْنَ اَخِی ۝۳۰﴾ ''میرے بھائی ہارون کو۔''

آپؑ نے اس وزارت کے لیے اپنے بھائی کا نام بھی خود ہی تجویز کر دیا۔

آیت ۳۱ ﴿اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ۝۳۱﴾ ''اس کے ذریعے سے میری کمر کو مضبوط کر دے۔''

آیت ۳۲ ﴿وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۝۳۲﴾ ''اور اسے میرے اس کام میں شریک بنا دے۔''

آیت ۳۳ ﴿كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ۝۳۳﴾ ''تاکہ ہم تیری تسبیح کریں کثرت کے ساتھ۔''

آیت ۳۴ ﴿وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ۝۳۴﴾ ''اور تیرا ذکر کریں کثرت کے ساتھ۔''

آیت ۳۵ ﴿اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ۝۳۵﴾ ''یقیناً تُو ہمیں دیکھ رہا ہے۔''

تو خود ہمارے حالات کا چشم دید گواہ ہے۔

آیت ۳۶ ﴿قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰی ۝۳۶﴾ ''فرمایا: اے موسیٰؑ تمہیں عطا کر دیا گیا جو تم نے طلب کیا۔''

تمہاری درخواست ہم نے من وعن قبول کر لی۔

آیت ۳۷ ﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓی ۝۳۷﴾ ''اور ہم تو تم پر احسان کر چکے ہیں ایک مرتبہ پہلے بھی۔''

آیت ۳۸ ﴿اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّكَ مَا یُوْحٰٓی ۝۳۸﴾ ''جب ہم نے تمہاری والدہ کی طرف وحی کی تھی جو (اب تمہیں) وحی کی جا رہی ہے۔''

یعنی اب ہم آپؑ کو وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں کہ آپؑ کی والدہ کو اس وقت ہم نے کیا وحی کی تھی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے زمانے میں بھی فرعون کا حکم تھا کہ بنی اسرائیل میں سے کسی کے ہاں اگر بیٹا پیدا ہو تو اسے قتل کر دیا جائے اور صرف ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی یا الہام کے ذریعے ان کے نومولود بچے کے بارے میں ہدایت کی:

آیت ۳۹ ﴿اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ﴾ ''کہ اس کو ایک صندوق میں بند کرو، پھر اسے دریا میں ڈال دو''

﴿فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ﴾ ''چنانچہ دریا اسے ساحل

پر ڈال دے گا' (وہاں سے) اس کو اٹھا لے جائے گا وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس (بچے) کا بھی دشمن ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف کی جانے والی وحی کے بارے میں یہاں مزید تفصیل بیان نہیں فرمائی گئی' بلکہ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے براہِ راست خطاب شروع ہو رہا ہے۔ یہ قرآن کا خاص اسلوب ہے کہ کچھ چیزیں پڑھنے اور سننے والے پر چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ سیاق وسباق کے مطابق خود سمجھ جائے۔ بہرحال اس واقعہ کی مزید تفصیلات یوں ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے آپؑ کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ آپؑ کی بڑی بہن اپنی والدہ کی ہدایت کے مطابق صندوق پر نظر رکھے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ صندوق کے شاہی محل میں پہنچنے کی خبر بھی بچی کے ذریعے والدہ کو مل گئی۔ ادھر فرعون بچے کو قتل کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اس کی بیوی حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا (جو بنی اسرائیل میں سے تھیں اور نیک خاتون تھیں) نے اس کو سمجھایا کہ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہے' یہ بچہ میری اور آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہوگا' ہم اسے اپنا بیٹا بنا لیں گے' چنانچہ آپ اسے قتل نہ کریں۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنی محبت کا پرتو ڈال کر آپؑ کے چہرے کو انتہائی پرکشش بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپؑ کی صورت ایسی من موہنی تھی کہ ہر شخص دیکھتے ہی آپؑ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

﴿وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ ۝۳۹﴾ ''اور (اے موسیٰ علیہ السلام!) میں نے تم پر اپنی محبت کا پرتو ڈال دیا' تاکہ تم کو پالا جائے میری آنکھوں کے سامنے۔''

لِتُصْنَعَ کے لفظی معنی ہیں: ''تاکہ تم کو بنایا جائے''۔ اسی مادہ سے لفظ مَصْنَع مشتق ہے جس کے معنی کارخانہ کے ہیں۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کی تربیت کا کارخانہ فرعون کا محل قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ پر اپنی محبت کا پرتو ڈال کر آپؑ کی شکل میں ایسی کشش پیدا کر دی تھی کہ دشمن بھی دیکھتے تو گرویدہ ہو جاتے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ آپؑ کی پرورش کے انتظامات خصوصی طور پر شاہی محل میں کیے جانے منظور تھے۔

آیت ۴۰ ﴿اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُكَ﴾ ''جب تمہاری بہن چلتی جا رہی تھی''

اور وہ چلتے چلتے فرعون کے محل تک پہنچ گئی جہاں بچے کو فوری طور پر دودھ پلانے کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی بھی عورت کا دودھ پینے سے منع کر دیا تھا۔ جب بہت سی عورتیں بلائی گئیں اور وہ سب کی سب آپؑ کو دودھ پلانے میں ناکام

رہیں تو آپؑ کی بہن جو یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی بول پڑی:

﴿فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ﴾ ''تو اُس نے کہا: کیا میں تمہیں بتاؤں اس (خاندان) کے بارے میں جو اس کی کفالت کرے؟''

آپؑ کی بہن نے اپنی ہی والدہ کے بارے میں ان لوگوں کو مشورہ دیا۔ چنانچہ جب آپؑ کی والدہ کو بلایا گیا تو آپؑ نے ان کا دودھ فوراً پی لیا۔

﴿فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ﴾ ''تو یوں ہم نے لوٹا دیا تمہیں تمہاری والدہ کی طرف' تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ غم نہ کھائے۔''

چنانچہ مامتا کی تسلی و تسکین کے لیے بچے کو واپس والدہ کی گود میں پہنچا دیا گیا۔ مقامِ غور ہے! اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے جذبات و احساسات کا کس حد تک پاس ہے۔

﴿وَقَتَلْتَ نَفْسًا﴾ ''اور (پھر) تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا''

پھر جب آپؑ جوان ہوئے اور مصر میں آپؑ کے ہاتھوں ایک قبطی قتل ہو گیا:

﴿فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۣ﴾ ''تو ہم نے تم کو اس غم سے بھی نجات دلائی' اور پھر ہم نے تمہیں (مزید بہت سی) آزمائشوں سے گزارا۔''

﴿فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ﴾ ''پھر تم کئی سال اہلِ مدین میں رہے''

آپؑ کے مدین پہنچنے اور وہاں ٹھہرنے کے بارے میں تفصیل سورۃ القصص میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں صرف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝۴۰﴾ ''پھر تم یہاں آ گئے ایک طے شدہ فیصلے کے مطابق اے موسیٰؑ!''

یعنی اس وقت آپؑ کا یہاں پہنچنا کسی حسن اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طے شدہ پروگرام کا حصہ ہے۔ میں نے آپؑ کے سب معاملات کے متعلق باقاعدہ منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ آپؑ نے اس سے پہلے جو کچھ کیا' آپؑ جہاں جہاں رہے' یہ سب اس منصوبہ بندی کا حصہ تھا اور اب اسی منصوبہ بندی اور ایک طے شدہ فیصلے کے مطابق آپؑ اس جگہ پہنچ گئے ہو۔

آیت ۴۱ ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝۴۱﴾ ''اور میں نے تم کو بنایا ہے خاص اپنے لیے۔''

اِصْطَنَعْتُ' صَنَعْتُ سے بابِ افتعال ہے۔ ص کی مناسبت سے ت یہاں ط سے

بدل گئی ہے۔ یعنی میں نے آپؑ کی شخصیت کو خصوصی طور پر تیار کیا ہے۔ شاہی محل کے اندر مخصوص ماحول میں آپؑ کی پرورش کرائی ہے اور بعض خصوصی صلاحیتیں آپؑ کی شخصیت میں پیدا کی ہیں۔ اس لیے کہ مجھے آپؑ سے ایک بڑا کام لینا ہے۔

آیت ۴۲ ﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝۴۲﴾ ''جاؤ تم اور تمہارا بھائی میری ان نشانیوں کے ساتھ اور میرے ذکر سے سُستی نہ کرنا۔''

آیت ۴۳ ﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۴۳﴾ ''جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس' یقیناً وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔''

آیت ۴۴ ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝۴۴﴾ ''تو (دیکھو!) اس کے ساتھ نرم (انداز میں) بات کرنا' شاید کہ اس طرح وہ سوچے یا ڈرے۔''

آیت ۴۵ ﴿قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝۴۵﴾ ''انہوں نے عرض کیا: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ (اچانک) ہمارے اوپر بھڑک اٹھے گا یا زیادتی کرے گا۔''

آیت ۴۶ ﴿قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝۴۶﴾ ''فرمایا: تم ڈرو نہیں' یقیناً میں تم دونوں کے ساتھ ہوں' میں ہر بات سنتا اور دیکھتا رہوں گا۔''

آیت ۴۷ ﴿فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ﴾ ''پس تم دونوں جاؤ اُس (فرعون) کے پاس اور اس سے کہو کہ بلاشبہ ہم دونوں رسول ہیں تیرے رب کی جانب سے' پس ہمارے ساتھ بھیج دے بنی اسرائیل کو اور انہیں عذاب میں مبتلا مت رکھ۔''

﴿قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝۴۷﴾ ''یقیناً ہم آئے ہیں ایک نشانی لے کر تیرے رب کی طرف سے۔ اور سلامتی اُن پر ہے جو ہدایت کا اتباع کریں۔''

آیت ۴۸ ﴿اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۴۸﴾ ''ہماری طرف یہ وحی کی جا چکی ہے کہ اُس پر عذاب آئے گا جس نے جھٹلایا اور منہ پھیر لیا۔''

چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) نے فرعون کے دربار میں پہنچ کر اللہ کا پیغام پوری تفصیل کے ساتھ اُس تک پہنچا دیا۔

آیت ۴۹ ﴿قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾﴾ ’’فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ! تم دونوں کا رب ہے کون؟‘‘

ہم تو کسی ایسے ربّ سے واقف نہیں ہیں جس کے بارے میں تم دونوں بات کر رہے ہو۔ تمہارا ربّ ہے کون؟

آیت ۵۰ ﴿قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾﴾ ’’موسیٰؑ نے کہا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی خِلقت عطا کی‘ پھر ہدایت دی۔‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو ایک خاص شکل اور ہیئت کے مطابق تخلیق کیا ہے اور پھر ہر مخلوق کی خلقت کے عین مطابق اسے جبلی ہدایت بھی عطا کی ہے۔ مثلاً اس نے بکری کو جبلی ہدایت دی ہے کہ اس کی غذا گوشت نہیں ہے‘ گھاس وغیرہ ہے اور شیر کو جبلی ہدایت دی ہے کہ اس کی غذا گھاس نہیں‘ گوشت ہے‘ اسی طرح ہر چیز کو جبلی طور پر اس نے مخصوص عادات واطوار اور خصوصیات کا پابند کر دیا ہے۔

آیت ۵۱ ﴿قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾﴾ ’’فرعون نے کہا: تو پھر پہلی نسلوں کا کیا حال ہوگا؟‘‘

یعنی اگر ہم تمہارا یہ دعویٰ تسلیم کر لیں کہ تم اللہ کے رسول ہو اور تمہاری پیروی میں ہی ہدایت ہے تو پھر ہمارے آباء واَجداد جو اس سے پہلے فوت ہو چکے ہیں‘ ہماری کئی نسلیں جو اس دنیا سے جا چکی ہیں‘ ان کے پاس تو کوئی رسول نہیں آیا تھا‘ ان تک ایسی کوئی دعوت نہیں پہنچی تھی اور وہ اسی طریقے پر فوت ہوئے جسے تم گمراہی قرار دے رہے ہو۔ تو ان سب لوگوں کے بارے میں تمہارا کیا فتویٰ ہے؟ اُن سب کا کیا بنے گا؟

یہ ایک ٹیڑھا سوال تھا جس کا جواب بڑے حکیمانہ انداز میں دینے کی ضرورت تھی۔ ہمارے جیسا کوئی داعی ہوتا تو کہہ دیتا کہ وہ سب جہنمی ہیں! ایسے جواب کے ردِّعمل کے طور پر مخاطبین کی اپنے اسلاف کے بارے میں عصبیت وحمیت کو ہوا ملتی اور صورتِ حال بگڑ جاتی۔ بہرحال حکمتِ تبلیغ کا تقاضا یہی ہے کہ دعوت کے دوران مخاطبین کے جذبات اور مخصوص موقع محل کو مدنظر رکھا جائے تاکہ کسی بھی قسم کی منفی صورتِ حال پیدا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے کمال حکمت سے جواب دیا:

آیت ۵۲ ﴿قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾﴾ ’’موسیٰؑ نے کہا کہ ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب کے اندر ہے۔ میرا رب نہ تو بھٹکتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔‘‘

میرا ربّ ہی جانتا ہے کہ ایسے لوگ جن کے پاس اللہ کی طرف سے دعوت لے کر کوئی رسول نہیں آیا‘ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ میرا رب ان تمام لوگوں کے حالات سے خوب واقف ہے‘ نہ تو اس سے غلطی ہوتی ہے اور نہ ہی وہ بھولتا ہے۔ چنانچہ ان کے بارے میں وہ خود ہی مناسب فیصلہ کرے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے درباریوں کو یہ مسکت جواب دینے کے بعد اپنی تقریر جاری رکھی:

آیت ۵۳ ﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ﴾ ’’وہی جس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا‘ اور اس میں تمہارے (چلنے کے) لیے راستے بنائے اور آسمان سے پانی نازل کیا۔‘‘

﴿فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾﴾ ’’پھر ہم نے اس (پانی) سے نکالے طرح طرح کے نباتات۔‘‘

آیت ۵۴ ﴿كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾﴾ ’’کھاؤ تم خود بھی اور چراؤ اپنے مویشیوں کو بھی۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لیے۔‘‘

آیت ۵۵ ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾﴾ ’’اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے‘ اور اسی میں سے ہم تمہیں ایک مرتبہ پھر نکالیں گے۔‘‘

❁❁❁

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

وجوبِ التزامِ سُنّت

(سُنّت کو لازم پکڑنا)

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے ۲۵/اپریل اور ۲/مئی ۲۰۰۸ء کے خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝ (النساء)

عَنْ اَبِیْ نَجِیْحٍ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ :

وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَوْعِظَةً وَّجِلَتْ مِنْھَا الْقُلُوْبُ، وَذَرَفَتْ مِنْھَا الْعُیُوْنُ، فَقُلْنَا: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! کَاَنَّھَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا، قَالَ: ((اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ، فَاِنَّہٗ مَنْ یَّعِشْ مِنْکُمْ بَعْدِیْ فَسَیَرَی اخْتِلَافًا کَثِیْرًا، فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ، تَمَسَّکُوْا بِھَا، وَعَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ، وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَکُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) (۱)

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب السنة‘ باب فی لزوم السنة۔ وسنن الترمذی‘ابواب العلم‘باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ وقال : حدیث حسن صحیح

سیدنا ابونجیح عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

’’رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک وعظ فرمایا جس سے دل کانپ اٹھے اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ہم نے کہا: یارسول اللہ! یہ تو گویا الوداع کہنے والے (یعنی چھوڑ کر جانے والے) کا سا وعظ ہے۔ آپ ہمیں مزید وصیت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور وصیت کرتا ہوں کہ (اپنے حکام وامراء کے) احکام سننا اور اطاعت کرنا‘ خواہ تم پر کوئی حبشی غلام ہی حاکم بن جائے۔ تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ یقیناً بہت سے اختلافات دیکھے گا‘ پس (ان حالات میں) تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت (طریقہ) کو لازم پکڑنا اور اسے داڑھوں سے قابو کرنا۔ دین میں نئے نئے کاموں کے ایجاد کرنے سے بچ کر رہنا‘ کیونکہ دین میں ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔‘‘

معزز سامعین کرام!

آج ہمارے زیر مطالعہ اربعین نووی کی حدیث نمبر ۲۸ ہے۔ گویا آج اس کتاب کا دو تہائی حصہ مکمل ہو جائے گا —— اس مجموعہ احادیث کا نام اگرچہ اربعین ہے لیکن اس میں کُل ۴۲ احادیث ہیں‘ جس کا دو تہائی ۲۸ احادیث بنتی ہیں —— اس حدیث کے راوی عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ حدیث سنن ابی داوٗد اور جامع ترمذی دونوں میں موجود ہے‘ اور امام ترمذی کا کہنا ہے کہ یہ حدیث ’’حسن صحیح‘‘ ہے‘ یعنی سند کے اعتبار سے بہت ہی پختہ ہے۔ اس میں متعدد باتیں بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک کو جوامع الکلم میں سے شمار کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کا نظامِ اطاعت

اس حدیث میں چند اہم امور کا حکم دیا گیا ہے‘ جن میں سے ایک سمع و طاعت ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک نظامِ اطاعت تھا جو پہلے مسلمانوں میں بحیثیت جماعت اور پھر اسلامی حکومت میں رائج ہوا۔ اس نظامِ اطاعت کی تشریح کے لیے میں نے ابتدا میں سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کی تلاوت کی

ہے۔ یہ آیت اس اعتبار سے قرآن مجید کی اہم ترین آیات میں سے ہے کہ اس میں اسلامی ریاست کے دستور کا ایک اہم اور بنیادی اصول بیان ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴿۵۹﴾﴾

''اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی (اطاعت کرو)۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم واقعتاً اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے بھی بہت مفید ہے۔''

دیکھئے' یہاں بہت عجیب اسلوب ہے کہ تین ہستیوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے: اللہ کی' رسول کی اور اولوالامر کی' لیکن پہلے دو کے لیے ''اَطِیْعُوْا'' کا لفظ آیا ہے' جبکہ تیسرے کے لیے نہیں آیا ـــــ ایک اسلوب تو یہ ہو سکتا تھا کہ ''اَطِیْعُوْا'' ایک مرتبہ آ جاتا اور اس کا اطلاق تینوں پر ہو جاتا' جیسے الجبرا میں بریکٹ کے باہر جو شے ہو وہ بریکٹ کے اندر موجود ہر شے سے ضرور ضرب کھائے گی۔ دوسرا اسلوب یہ ہو سکتا تھا کہ ''اَطِیْعُوا'' تیسری مرتبہ بھی آتا' لیکن قرآن نے یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ ''اَطِیْعُوا'' پہلے دو کے ساتھ ہے' تیسرے کے ساتھ نہیں ہے۔ اصل میں اس اسلوب سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت مطلق' دائم' غیر مشروط اور غیر محدود ہے' یعنی اللہ اور رسول (ﷺ) کا ہر حکم بلاکم و کاست اور بلا چون و چرا ماننا ہر مسلمان پر لازم ہے' لیکن صاحبِ امر کی اطاعت مطلق نہیں ہے' بلکہ اس کی اطاعت اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہوگی۔

اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت مطلق' دائمی اور مستقل ہے!

مذکورہ آیت کے اسلوب سے یہ واضح ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت مطلق' دائمی اور مستقل ہے' جبکہ ہمارے ہاں بہت عرصے سے ایک فتنہ اٹھا ہے اور یہ لوگ رسول

اللہ ﷺ کی اطاعت کو دائمی اور مستقل ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ اس فتنے کو شروع کرنے والے سرسید احمد خان تھے جو قومی اعتبار سے تو ہمارے ہیروز میں شمار ہوتے ہیں' لیکن دینی اعتبار سے انہوں نے بہت سی گمراہیوں کا آغاز کیا ہے' جن میں سے ایک ''استخفافِ حدیث'' بھی ہے' یعنی حدیث کو خفیف سمجھنا اور حدیث کی قدر و منزلت کو کم سمجھنا۔ اس کے بعد سے یہ فتنہ بڑھتا چلا گیا اور ہمارے ہاں باقاعدہ ''اہلِ قرآن'' کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا' جنہوں نے کہا کہ ہم تو صرف قرآن کو مانیں گے' قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز واجب التعمیل نہیں ہے۔

یہ لوگ درحقیقت ''منکرین حدیث'' ہیں اور ان میں ایک بہت بڑا شخص غلام احمد پرویز تھا جو پاکستان میں فوت ہوا ہے۔ غلام احمد پرویز اچھا انشاء پرداز تھا اور گفتگو بھی اچھی کر لیتا تھا۔ ظاہر بات ہے کہ فتنہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس میں کوئی صلاحیت ہو۔ بغیر صلاحیت کے نہ کوئی نیکی کا کام ہو سکتا ہے اور نہ بدی کا۔ بدی کا کام کرنے کے لیے بھی صلاحیت چاہیے' قوت چاہیے' لہٰذا اس میں صلاحیتیں تھیں تو اس نے انکارِ حدیث کا فتنہ پھیلایا۔ البتہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے وہ اپنے رسالے ''طلوعِ اسلام'' کے سرورق پر ہمیشہ ایک حدیث شائع کرتا۔ وہ احادیث جو اخلاقی نوعیت کی ہوں یا جن میں کچھ فضائل اعمال کا ذکر ہو یا جن میں برے اخلاق کی نفی کی گئی ہو۔ ظاہر بات ہے ان حدیثوں پر کوئی فقہی احکام مرتب نہیں ہوتے۔ یہ تو اخلاقی تعلیمات ہیں یا ایمانیات کا معاملہ ہے' لیکن وہ احادیث جن سے احکام کا استنباط ہوتا ہے' ان کے بارے میں اس کے موقف کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس لیے کہ اس شخص کے اثرات ہمارے معاشرے میں کافی پھیلے ہوئے ہیں اور آج اسی کی باقیات ہمارے ہاں خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا پر بہت نمایاں ہیں۔

ان کا اصول یہ ہے کہ ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' یعنی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا معاملہ صرف دورِ نبویؐ کے لیے تھا' کیونکہ اُس وقت آپؐ مسلمانوں کے امیر بھی تھے' تو بحیثیت امیر المسلمین اور امیر المؤمنین آپؐ کا حکم ماننا لازمی تھا' لیکن آپؐ کی اطاعت ہمیشہ کے لیے لازم نہیں ہے۔ یہ بات بہت بڑی گمراہی ہے۔ اسی لیے میں نے عرض

کیا کہ اطاعتِ خداوندی (اطاعتِ قرآن) اور اطاعتِ رسول (صحیح حدیث کی اطاعت) دونوں مستقل، دائمی اور غیر مشروط ہیں۔ ان میں کوئی بات خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، ان پر عمل کرنا ہر حال میں لازم ہے۔

صاحبِ امر کی اطاعت مقیّد اور مشروط ہے!

زیرِ مطالعہ آیت میں صاحبِ امر کے حوالے سے ''اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی تم (مسلمانوں) میں سے جو صاحبِ امر ہو اُس کی اطاعت لازم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم آپ پر حاکم بن گیا تو اس کی اطاعت آپ پر فرض نہیں ہے، بلکہ آگے بڑھ کر پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی حکومت کو ختم کیا جائے، اس سے نجات حاصل کی جائے، اس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ لیکن مسلمانوں میں سے جو بھی تمہارا امیر ہے اس کی اطاعت تم پر لازم ہے، البتہ یہ اطاعت اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے تابع ہے۔ اگر تو وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام کے مطابق حکم دے تو اسے ماننا لازم ہے اور اگر خلافِ شریعت کوئی حکم دے تو نہ ماننا لازم ہے۔

صاحبِ امر حضور ﷺ کے زمانے میں بھی ہوتے تھے۔ حضور ﷺ تو اللہ کے رسول بھی تھے اور مسلمانوں کے امیر اور سپہ سالار بھی، لیکن آپ ﷺ کی امارت کے تحت چھوٹی امارتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً آپ ﷺ نے کوئی لشکر بھیجا جس کے ساتھ آپؐ خود نہیں گئے —— جنہیں ہم سرایا کہتے ہیں —— ظاہر بات ہے اس میں کسی کو تو امیر بنایا گیا۔ اب اس امیر کی اطاعت بھی ضروری ہے، لیکن اس کی اطاعت معروف میں ہے۔ اس کو اختیار نہیں ہے کہ وہ جو چاہے حکم دے۔ چنانچہ دورِ نبویؐ میں بالفعل اسی طرح کا ایک واقعہ بھی پیش آ گیا۔ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کی ایک جماعت روانہ کی اور اس میں ایک صاحب کو امیر بنایا۔ وہ امیر صاحب ذرا جلالی مزاج کے تھے، کسی بات پر وہ اپنے ساتھیوں سے ناراض ہو گئے تو انہوں نے ایک بہت بڑا گڑھا کھودنے کا حکم دیا۔ صحابہ کرامؓ نے گڑھا کھود دیا، اس لیے کہ اس میں تو کوئی خلافِ شریعت بات نہیں تھی۔ پھر امیر نے حکم دیا کہ اس میں لکڑیاں لا کر ڈال دو، ڈال دی گئیں۔ حکم دیا ان میں آگ لگا دو، لگا دی گئی۔ اس کے بعد

اس نے حکم دیا کہ اس میں کود جاؤ۔ اس پر صحابہؓ نے کہا کہ اسی آگ سے بچنے کے لیے تو ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کا دامن تھاما تھا اور آپ ہمیں اسی میں کودنے کا حکم دے رہے ہیں، تو لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ یعنی ہم آپ کا یہ حکم نہیں مانیں گے۔ جب یہ بات حضور ﷺ کے علم میں لائی گئی تو آپ ﷺ نے توثیق فرمائی کہ انہوں نے صحیح کیا۔ مزید آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ اُس آگ میں داخل ہو جاتے تو پھر کبھی اس میں سے نہ نکل پاتے۔ لہٰذا حضور ﷺ کے بعد کسی امیر کا حکم مطلق نہیں ہے، چاہے وہ امیر صحابی ہی کیوں نہ ہو۔ صحابی کا حکم بھی مطلق نہیں ہے، بلکہ اسے بھی اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اگر اس کے اوپر پورا اترتا ہے تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ورنہ اسے رد کر دیا جائے گا۔

ائمہ فقہ کی اطاعت بھی اللہ اور رسولؐ کے تابع ہے

ائمہ فقہ کی اطاعت کا معاملہ بھی امیر کی اطاعت کی طرح مقید اور مشروط ہے، بایں طور کہ ان کی اطاعت بھی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے ضمن میں ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو قول موجود ہے کہ اگر میری کسی رائے کے خلاف تمہیں کوئی صحیح حدیث مل جائے تو میری رائے کو دیوار پر دے مارو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے تک ابھی احادیث پوری طرح جمع نہیں ہوئی تھیں اور جمعِ حدیث کا عمل جاری تھا، لہٰذا ساری احادیث ان کے علم میں نہیں تھیں۔ یہ تو ان کی بہت بڑی قابلیت ہے کہ ان کی کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو بعد میں حدیث کی رو سے غلط ثابت ہوئی ہو۔ ہاں کوئی اختلاف تو ہو سکتا ہے، لیکن غلط ثابت ہونا اور بات ہے۔ اس اعتبار سے یہ ان کی بہت بڑی فضیلت ہے۔

اس طرح ان کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ جب سورۃ الجمعہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۙ﴿۲﴾ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۳﴾﴾

''وہی تو ہے جس نے بھیجا اُمیین میں سے ایک رسولؐ انہی میں سے، جو ان کو پڑھ

کرسناتا ہے اس کی آیات' اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں تعلیم دیتا ہے کتاب و حکمت کی' اور یقیناً اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔ اور ان میں سے دوسرے لوگوں کو بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے۔ اور وہ بہت زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔''

اس موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ سے کون مراد ہیں؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی اس وقت وہاں موجود تھے تو حضور ﷺ نے ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کے فرمایا کہ یہ اور اس کی قوم —— عربوں کے بعد سب سے پہلے جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے وہ ایرانی ہی تھے۔ اس لیے کہ دورِ خلافت راشدہ میں سب سے پہلے عراق فتح ہوا جس پر ایرانیوں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد شام فتح ہوا جس پر رومیوں کی حکومت تھی —— اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ عِنْدَ الثُّرَیَّا لَنَالَ لَهٗ رَجُلٌ مِنْ هٰؤُلَاءِ)) (۱) ''اگر ایمان ثریا کے پاس ہوتا تو بھی ان میں سے ایک شخص اسے پالیتا''۔ علامہ جلال الدین سیوطی اور بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے امام ابوحنیفہؒ مراد ہیں اور یہ بشارت انہی کے لیے ہے' کیونکہ وہ نسل کے اعتبار سے ایرانی تھے۔ لیکن حدیث کا مدّعا یہ نہیں ہے کہ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ صرف ایرانیوں میں سے ایک یا چند آدمی ہیں' بلکہ اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو قیامت تک اسلام میں داخل ہوتے رہیں گے۔

''وعظ'' کا مفہوم اور اہمیت

اس تمہید کے بعد اب ہم حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَوْعِظَةً —— ایک روایت میں ذَاتَ یَوْمٍ کے الفاظ بھی ہیں —— ''اللہ کے رسول ﷺ نے ایک دن ہمیں وعظ ارشاد فرمایا''۔ یہ وعظ کا لفظ نوٹ کیجیے۔ آج کل عام فضا عقلیت (rationalism) کی ہے کہ بھئی دلیل سے بات کرو۔ آپ کی یہ بات ہماری عقل میں نہیں آ رہی۔ ہماری عقل

(۱) صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قوله وآخرین منهم لما یلحقوا بهم۔ وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابة' باب فضل فارس۔

آپ کی بات ماننے اور تسلیم کرنے کے حق میں نہیں۔ اسی طرح جب کوئی شخص وعظ کہہ رہا ہو تو لوگ ذرا حقارت کے ساتھ کہتے ہیں کہ وعظ کہہ رہے ہیں جی۔ یعنی ان کے نزدیک وعظ کوئی اعلیٰ اور عمدہ شے نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وعظ کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اس میں اگرچہ منطق کا استعمال نہیں ہوتا' لیکن اس میں استدلالی اور جذباتی انداز میں دل اور روح کو براہِ راست مخاطب اور متوجہ کیا جاتا ہے۔ ایک ہے کہ آپ کسی بات کو دماغ اور عقل کے ذریعے سے دل میں اتارتے ہیں۔ عقلیت پسند (rationalists) لوگوں کا معاملہ یہی ہوتا ہے کہ جب تک ان کی عقل کسی شے کو تسلیم نہ کرے تو وہ دل میں نہیں اترتی۔ اس اعتبار سے عقل ایک رکاوٹ (barrier) ہے اور عقل کا معنی ہی 'باندھنے والی شے' ہے۔ عربی لوگ سفر کے دوران آرام کی غرض سے کہیں رکنے کے وقت اپنے اونٹ کا ایک گھٹنا باندھ دیتے تھے' یعنی ایک ٹانگ کو گھٹنے سے موڑ کر اسے کسی رسی سے باندھ دیتے۔ اس حالت میں وہ ذرا اُچک اُچک کر کسی کیکر کے درخت پر تو منہ مار لے گا مگر وہ بھاگ کر دور نہیں جا سکتا۔ اونٹ کے گھٹنے کو باندھنے والی رسی کو ''عِقال'' کہتے ہیں۔ یہ جو عربوں کا رواج ہے کہ وہ اپنے سر پر بڑی قیمتی رسی ''عِقال'' باندھتے ہیں' اصل میں یہ وہی رسی ہے جس کے ساتھ اونٹ کا گھٹنا باندھا جاتا تھا۔ آرام کے وقت تو رسی سے اونٹ کا گھٹنا باندھ دیتے' لیکن جب دوبارہ سفر کا آغاز کرتے تو اسے کھول کر اپنے سر کے اوپر لپیٹ لیتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنی اونٹنی کھلی چھوڑی۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو اس سے فرمایا: ((اِعْقِلْهَا وَتَوَکَّلْ))(۱) ''اس کا گھٹنا باندھو اور اللہ پر توکّل کرو!''☆ یعنی پہلے دنیا کے وسائل استعمال کرو اور پھر اللہ پر توکل کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ ان وسائل کی وجہ سے تمہاری مرضی کا نتیجہ نکل آئے گا' نتیجہ

(۱) مشکلة الفقر للالبانی' ح:۲۲۔ اس مضمون کی احادیث سنن ترمذی' صحیح ابن حبان اور دیگر کتب حدیث میں بھی منقول ہیں۔

☆ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی لائقِ توجہ ہے: ◀

تو بالآخر اللہ کی مرضی کے مطابق ہوگا‘ لیکن وسائل اور ذرائع استعمال نہ کرنا غلط ہے۔

خلیل جبران ایک عرب ادیب اور بہت مفکّر قسم کا آدمی تھا‘ اس کا ایک جملہ بہت پیارا اور بہت عمدہ ہے: ’’عقل سے روشنی حاصل کرو‘ لیکن جذبے کے تحت حرکت کرو‘‘۔ عقل انسان کو حرکت نہیں کرنے دیتی‘ اس لیے کہ عقل کے معنی ہی روکنے کے ہیں۔ عقل روشنی اور چراغ کی مانند تو ہے کہ راستہ دکھا دیتی ہے‘ لیکن جب راستہ نظر آ جاتا ہے تو پھر عافیت اور مصلحت کے نام پر چلنے میں قدم قدم پر رکاوٹ ڈالتی ہے۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

آگ میں کود جانا عقل کے تحت تو نہیں ہو سکتا‘ اس لیے کہ عقل تو جان بچانے کا کہتی ہے۔ حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کے لیے جب آگ کے انگارے زمین پر بچھا دیے گئے اور ان سے کہا گیا کہ ان پر لیٹ جاؤ تو وہ لیٹ گئے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کا حکم تھا کہ جو بھی تکلیف آئے اسے اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھو اور کوئی جوابی کارروائی نہ کرو! یہ ہے اصل میں عشق اور یقین جس کے تحت آدمی حرکت کر سکتا ہے۔ دوسری طرف عقل کا معاملہ یہ ہے کہ وہ قدم قدم پر اڑنگے لگائے گی‘ آپ کو مصلحت سکھائے گی اور اپنے جان و مال کو بچانے کا مشورہ دے گی۔

قرآن بھی وعظ (مَوعِظَة) ہے

وعظ کے معنی نصیحت کے ہیں اور اس میں اصل مخاطب انسان کا وہ جذبہ ہے جس کا تعلق روح کے ساتھ ہے۔ بعض لوگوں کی روح مر چکی ہوتی ہے تو ان پر وعظ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی مثال ایسے ہے جیسے چکنے گھڑے پر پانی پڑا اور وہ فوراً پھسل گیا‘ لیکن

◄ ((مَثَلُ الْقُرْآنِ مَثَلُ الْإِبِلِ الْمُعَقَّلَةِ إِنْ تَعَاهَدَهَا صَاحِبُهَا بِعُقُلِهَا أَمْسَكَهَا عَلَيْهِ وَإِنْ أَطْلَقَ عُقُلَهَا ذَهَبَتْ)) (ابن ماجه)

’’قرآن کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جس کا گھٹنا بندھا ہوا ہو کہ اگر اس کا مالک اسے باندھے رکھے تو رکا رہتا ہے اور اگر کھول دے تو چلا جاتا ہے۔‘‘

جن کی ارواح کچھ زندہ ہوتی ہیں —— چاہے کمزور ہیں‘ مضمحل ہیں لیکن ہیں ابھی زندہ‘ مری نہیں ہیں — تو ان پر وعظ کا اثر ہوتا ہے۔ سورۂ یونس میں قرآن مجید کو بھی ’’مَوعِظَة‘‘ کہا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷﴾

’’اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور تمہارے سینوں (کے اَمراض) کی شفا اور اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور (بہت بڑی) رحمت۔‘‘

قرآن کا پہلا کام وعظ ہے‘ یعنی قرآن دلوں پر اثر کرتا ہے‘ دلوں کو نرم کرتا ہے اور جب دل نرم ہو جاتے ہیں تو پھر ان میں بات داخل ہوتی ہے۔ جیسے سخت زمین پر بارش برسے گی تو پانی اس میں جذب نہیں ہوگا اور اگر آپ نے زمین کو ہل چلا کر نرم کیا ہوا ہے تو وہ پانی جذب ہو جائے گا۔ قرآن کا دوسرا کام ہے: ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ کہ سینوں کے اندر جو روگ اور امراض موجود ہیں یہ ان کی دوا ہے‘ مگر ضروری ہے کہ یہ دوا سینے اور دل میں داخل ہو۔ فرض کیجیے ایک شخص کو مسلسل قے آ رہی ہے‘ اس حالت میں آپ اسے دوا پلائیں گے تو فوراً قے کے ذریعے باہر آ جائے گی اور جب تک وہ دوا معدہ کے اندر جذب نہ ہو تو وہ کیا اثر دکھائے گی؟ (چنانچہ ایسے مریض کو آپ انجکشن کے ذریعے دوا اندر داخل کر دیتے ہیں اور وہ دوا فوراً خون میں شامل ہو جاتی ہے۔) اسی طرح انسان کا دل جب تک نرم نہ ہو اُس وقت تک قرآن دل پر اثر نہیں کرے گا اور پھر قرآن شفاء ثابت نہیں ہوگا۔

قرآن کی تیسری صفت ہے ’’هُدًى‘‘ یعنی یہ قرآن ہدایت ہے۔ لیکن دلوں میں تکبر‘ حُبِّ دنیا‘ حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال ہے تو یہ ہدایت اثر نہیں کرے گی۔ پہلے اس قرآن سے دل کی زمین نرم ہوگی‘ پھر وہ اندر داخل ہو کر ایسا اثر دکھائے گا کہ دل میں سے تمام منفی باتوں کی جڑیں اکھاڑ باہر پھینکے گا اور پھر آپ قرآن کی ہدایت سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۳﴾ کہ یہ قرآن تقویٰ والوں کے

لیے ہدایت ہے۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ هُدًی لِّلنَّاس ہے‘ لیکن فائدہ اٹھانے کے اعتبار سے تقویٰ شرط ہے اور تقویٰ کے بغیر آپ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے — قرآن کے بارے میں چوتھی بات یہ فرمائی: ﴿رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷﴾ کہ یہ قرآن اہلِ ایمان کے لیے رحمت ہے۔ یعنی دنیا میں یہ ہدایت ہے اور اس ہدایت کو اختیار کرنے والوں کے لیے آخرت میں رحمت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا الوداعی وعظ اور وصیتیں

لفظ ’’وعظ‘‘ کی تشریح کے بعد دوبارہ حدیث کے مطالعہ کی طرف آتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ایسا وعظ فرمایا: وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ ’’جس سے ہمارے دل کانپ گئے‘ لرز گئے‘‘ — حدیث کے متن سے بھی ثابت ہو گیا کہ وعظ کا اصل ہدف قلب ہے اور اس کا براہِ راست اثر دل میں موجود روح پر ہوتا ہے — وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ ’’اور ہماری آنکھیں بہہ پڑیں‘‘۔ یعنی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ہم پر رقت طاری ہو گئی۔

فَقُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! كَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ ’’تو ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ تو گویا الوداع کہنے والے یعنی چھوڑ کر جانے والے کا سا وعظ ہے‘‘۔ یعنی اس خطاب سے تو ایسے لگ رہا ہے جیسے آپ اس دنیا سے رخصت ہونے والے اور ہم سے پردہ کر کے دور ہو جانے والے ہیں۔ فَاَوْصِنَا ’’(اگر واقعی ایسا ہے) تو پھر ہمیں ذرا مزید وصیت کیجیے‘‘ — اب یہاں لفظ وصیت آ گیا۔ وصیت‘ نصیحت اور وعظ‘ یہ ایک ہی قبیل کے الفاظ ہیں اور ان کے معنوں میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے — صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب دیکھا کہ اس وعظ سے تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے حضور ﷺ ہمیں الوداع کہہ رہے ہیں تو انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں ایسی باتوں کی نصیحت فرما دیجیے جو آئندہ ہمارے لیے روشنی کا مینار بنیں۔

پہلی وصیت: اللہ کا تقویٰ اختیار کرو!

رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلی وصیت یہ فرمائی: ((اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ

عَزَّوَجَلَّ)) ’’میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی‘ جو بہت زبردست‘ بہت بلند و بالا ہے‘‘۔ — بعض روایات میں الفاظ آتے ہیں کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ((اُوْصِيْكُمْ وَنَفْسِيْ بِتَقْوَى اللّٰهِ)) ’’میں تمہیں بھی وصیت کرتا ہوں اور اپنے نفس کو بھی وصیت کرتا ہوں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی‘‘ — یعنی اللہ کی عظمت‘ جلالتِ شان‘ اس کے مواخذے اور اس کے محاسبے کا ایک احساس دل کے اندر قائم رہنا چاہیے۔ یہ بات تو ایک مؤمن کی معراج ہے کہ اس کو یہ یقین ہو جائے کہ گویا وہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کم از کم یہ کیفیت تو ضرور ہونی چاہیے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میں اللہ کے حضور میں ہوں۔ (I am in His presence) اس کے نتیجے میں تقویٰ پیدا ہو گا کہ اب بچ بچ کر چلنا ہے کہ کہیں کوئی غلط کام نہ ہو جائے‘ میرے اعضاء و جوارح سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بنے اور نہ کوئی ایسا خیال دل میں آنے پائے۔ اگر دل میں ایمان کے خلاف یا کسی گناہ اور برائی کا کوئی وسوسہ آ جائے تو انسان لاحول ولاقوۃ الا باللہ یا تعوذ پڑھ کر اللہ کی پناہ میں آ جائے اور اس برائی سے نفرت کا اظہار کرے۔ وسوسہ اندازی کا اختیار تو اللہ نے شیطان کو دیا ہوا ہے۔ سورۃ الناس میں ہے: ﴿اَلَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝﴾ ’’جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے‘‘۔ لہٰذا وسوسہ تو آ سکتا ہے‘ لیکن ایمان کی علامت یہ ہے کہ پھر انسان کو شدید دکھ ہو کہ میرے دل میں یہ وسوسہ کیوں آیا۔ بہرحال تقویٰ یہ ہے کہ نہ تو میرے دل میں کوئی ایسی بات آئے اور نہ میرے اعضاء و جوارح — میری زبان‘ میرے ہاتھ‘ میرے پاؤں‘ میری آنکھوں اور میرے منہ — سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جو اللہ کی ناراضگی کا باعث بنے۔

تقویٰ کا ترجمہ عام طور پر ’’ڈر‘‘ کر دیا جاتا ہے‘ جو اچھا ترجمہ نہیں ہے۔ غلط میں نہیں کہہ رہا‘ اس لیے کہ ڈر کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے۔ تقویٰ کا اصل مفہوم ’’بچنا‘‘ ہے‘ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے سے بچنا۔ اب یہ بچنا خوف کے تحت بھی ہو سکتا ہے اور محبت کے تحت بھی۔ جیسے ایک سعادت مند بیٹا باپ کے خوف سے کسی کام سے رک

جاتا ہے کہ باز پرس ہو جائے گی‘ مار پیٹ ہو جائے گی‘ سزا مل جائے گی۔ یہ رکنا خوف کی وجہ سے ہے‘ مگر بعض اوقات بیٹا اپنے باپ کی محبت کی وجہ سے بھی کسی کام سے رک جاتا ہے کہ میرے ایسا کرنے سے ابا کا دل خراب نہ ہو جائے‘ ابا کو اس سے رنج نہ پہنچے‘ میری اس حرکت سے ان کا دل نہ ٹوٹے۔ اب یہ محبت اور عظمت کے تحت ناراضگی سے بچنا ہے۔ لہٰذا تقویٰ میں یہ دونوں پہلو ہونے چاہئیں۔ آج کل انگریزی میں اس کا ترجمہ God consciousness کیا جا رہا ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ اچھا ترجمہ ہے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے تقویٰ کا ترجمہ بھی ڈر کر دیا گیا‘ انذار کا ترجمہ بھی ڈرانا کر دیا گیا اور خوف کے تو معنی ہی ڈر کے ہیں‘ تو ان مختلف الفاظ کا ایک ہی ترجمہ کرنے سے عیسائیوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ قرآن مجید خوف کے جذبے کو زیادہ حرکت میں لاتا ہے اور خوف ایک منفی (negative) جذبہ ہے‘ جبکہ بائبل اور حضرت مسیح علیہ السلام کے وعظ محبت کے جذبے کو اُبھارتے ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے‘ قرآن مجید میں بھی یہ سب پہلو موجود ہیں‘ اس میں کوئی شک کی بات نہیں‘ لیکن مختلف الفاظ کے ایک جیسے ترجمے کرنے سے ایسا تاثر ملتا ہے جیسے مجموعی طور پر (over all) یہاں پر ڈر اور خوف کی بات کی جا رہی ہے۔ چنانچہ واضح رہنا چاہیے کہ تقویٰ کے معنی ڈرنے کے نہیں‘ بچنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾ ’’اے اہل ایمان! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ!‘‘

دوسری وصیت: سنو اور مانو (امیر کی اطاعت کرو)

رسول اللہ ﷺ نے دوسری وصیت یہ فرمائی: ((وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ)) ’’(میں تمہیں وصیت کرتا ہوں) سمع وطاعت کی یعنی سنو اور مانو‘‘۔ سمع وطاعت درحقیقت دین کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ قرآن مجید کا جو بھی حکم آیا اسے سنو اور اس کو مانو‘ مزید یہ کہ اس کے مطابق عمل کرو۔ یہ نہیں کہ پہلے ہمیں سمجھایا جائے کہ اس میں کیا حکمت اور کیا فائدہ ہے۔ بلکہ اللہ کو مانتے ہو تو جو حکم آیا اس کو بھی مانو۔ اس میں کوئی چون و چرا اور کیوں‘ کیسے نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بھی جو حکم آیا اس کو

بھی بلا تردّد مانو۔ قرآن مجید میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: ﴿اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ (المائدۃ:۷) ’’کہ جب تم نے کہا کہ ہم نے (اللہ کا حکم) سنا اور اسے مانا‘‘۔ لہٰذا سننے اور ماننے کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ سن تو لیا ہے‘ لیکن ابھی غور کر رہے ہیں کہ اچھی بات ہے کہ نہیں‘ صحیح ہے کہ نہیں‘ اس میں مصلحت کیا ہے‘ اس میں تو یہ اندیشے ہیں‘ اس سے بہتر تو یہ رائے ہے‘ وغیرہ۔ اگر کسی حکم میں اس طرح کا لیت ولعل ہو جائے گا تو پھر ڈسپلن نہیں رہے گا۔

آپ کو معلوم ہے کہ اوّلاً مسلمانوں کی حیثیت ایک انقلابی جماعت کی سی تھی اور انقلابی جماعت میں جب تک سمع وطاعت اور ڈسپلن نہیں ہوگا‘ انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ اُس وقت مسلمانوں کی جماعت میں ایسا ڈسپلن تھا جیسے فوج کا ڈسپلن ہوتا ہے۔ فوج میں پہلا قانون ہی یہ ہے: listen and obey ’’سنو اور مانو!‘‘ اگر کوئی ماتحت فوجی اپنے افسر سے کہے: جناب! آپ جو حکم دے رہے ہیں‘ پہلے بتائیے کہ اس کی حکمت کیا ہے‘ فائدہ اور مصلحت کیا ہے‘ آپ کے سامنے اس کا کیا مقصد ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہ فوج نہیں رہی‘ کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔ فوج میں تو بس listen and obey کا اصول چلتا ہے۔ ہم نے میٹرک میں ایک بڑی پیاری نظم پڑھی تھی:

"The Charge of the Light Brigade"

’’لائٹ بریگیڈ‘‘ بمعنی برق رفتار یا روشنی کی طرح تیز رفتاری کے ساتھ چلنے والا۔ چھ سو گھڑ سواروں پر مشتمل اس بریگیڈ نے فوجی ڈسپلن کی اعلیٰ ترین مثال قائم کر کے دکھا دی۔ ان کو اپنے کمانڈر کی طرف سے پیش قدمی کا حکم ملا‘ جبکہ انہیں معلوم تھا کہ:

Cannon to right of them,
Cannon to left of them,
Cannon in front of them,

یعنی دشمن نے تینوں اطراف دائیں‘ بائیں اور سامنے توپیں نصب کر رکھی ہیں اور اس وقت پیش قدمی یقینی طور پر موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا سب نے سمجھا:

Some one had blundered

کہ کسی نے بہت بڑی غلطی کی ہے جو پیش قدمی کا حکم دیا ہے‘ لیکن

Theirs not to make reply,
Theirs not to reason why?
Theirs but to do and die!

ان کا کام یہ نہیں تھا کہ وہ اس کا جواب مانگتے یا وجہ طلب کرتے‘ بلکہ ان کا کام بہرصورت اس حکم پر عمل کرنا تھا۔موت آتی ہے تو آئے‘ چنانچہ:

Into the valley of death
Rode the six hundred.

چھ سو کے چھ سو افراد موت کی وادی میں اتر گئے اور سب ہلاک ہو گئے‘ کیونکہ تین طرف سے توپیں آگ برسا رہی تھیں اور اس کا یہی نتیجہ نکلنا تھا۔آپ ﷺ نے بھی فرمایا کہ میں تمہیں سمع وطاعت کی وصیت کرتا ہوں۔

دورِ نبوی ﷺ میں مسلمانوں کی جماعت میں سمع وطاعت کا ڈسپلن لاگو تھا اور بعد میں یہی معاملہ خلافت راشدہ میں تھا۔ان دونوں ادوار میں ایک فرق بھی تھا‘ وہ یہ کہ حضور ﷺ کے معاملے میں سوال کرنے کا اختیار بھی نہیں تھا‘ جبکہ خلافت راشدہ کے دور میں سوال کیا جاسکتا تھا۔اس ضمن میں ایک واقعہ بھی مشہور ہے کہ ایک دن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے تھے‘ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور کہا: **لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ** ’’نہ ہم سنیں گے اور نہ مانیں گے‘‘۔اب یہ کلمہ بغاوت حضرت سلمان فارسیؓ کے سوا کوئی اور شخص نہیں کہہ سکتا تھا—— سلمان فارسیؓ کے بارے میں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ سلمان تو ہمارے اہل بیت میں شامل ہے۔پھر ان کی ایک لمبی داستان ہے کہ طلبِ حق کی خاطر کون کون سی وادیوں اور مرحلوں سے گزر کر حضور ﷺ کے قدموں تک پہنچے ہیں—— انہوں نے کہہ دیا: **لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ**۔ اس پر حضرت عمرؓ نے برا نہیں منایا‘ بلکہ پوچھا: کیوں؟ کہنے لگے: آپؓ نے جو کرتا پہنا ہوا ہے‘ یہ اُن یمنی چادروں کا بنا ہوا ہے جو مالِ غنیمت میں آئی تھیں‘ اور ہر مسلمان کو ایک ایک چادر ملی تھی‘ جس میں کرتا نہیں بنتا‘ جبکہ آپ تو ہم میں طویل القامت ہیں تو آپ کا کُرتا کیسے بن گیا؟ گویا الزام عائد کیا گیا کہ آپؓ نے عام مسلمان سے زیادہ حصہ لیا ہے۔حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: عبداللہ! تم اس کا جواب دو۔انہوں نے کھڑے ہو کر وضاحت کی کہ میرے حصے

میں بھی ایک چادر آئی تھی‘ جس سے میرا کُرتا نہیں بن رہا تھا اور ابا جان کی چادر سے اُن کا کرتا نہیں بن رہا تھا تو میں نے اپنے حصے کی چادر ان کو دے دی تو اس سے یہ کرتا بن گیا۔ یہ وضاحت سن کر حضرت سلمانؓ نے کہا: **اَلْآنَ نَسْمَعُ وَنُطِيْعُ** ’’اب ہم سنیں گے بھی اور مانیں گے بھی‘‘۔یعنی یہ مغربی جمہوریت والی بات نہیں ہے کہ اپوزیشن نے ہر حال میں مخالفت (oppose) ہی کرنی ہے‘ ہر حال میں ٹانگیں گھسیٹنی ہی گھسیٹنی ہیں۔ نہیں‘ جب ایک بات کی وضاحت ہو گئی تو اب وہ معاملہ ختم ہوا۔

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ

رسول اللہ ﷺ نے مخلوق کی اطاعت کے حوالے سے ایک بنیادی اصول بیان فرما دیا: **((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))** (۱) ’’مخلوق میں سے کسی کی اطاعت نہیں ایسے کام میں جس میں اللہ کی نافرمانی لازم آئے‘‘۔ اگر شوہر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے خلاف کوئی حکم دے رہا ہے تو مسلمان بیوی پر اس کی اطاعت لازم نہیں ہے‘ بصورتِ دیگر اطاعت لازم ہے۔قرآن مجید میں بیویوں کے حوالے سے فرمایا گیا: ﴿**فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ**﴾ (النساء:۳۴) کہ نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں‘ اپنے شوہروں کا حکم ماننے والی ہوتی ہیں۔مثلاً ایک رائے شوہر کی ہے اور ایک بیوی کی‘ دونوں باتیں صحیح ہیں اور خلافِ شریعت کوئی بھی نہیں۔اب یا تو بیوی اپنی اپیل یا دلیل سے شوہر کو راضی کر لے‘ ورنہ اسے شوہر کی بات ماننی پڑے گی۔لیکن ایسی بات نہیں ہے کہ شوہر اگر شریعت کے خلاف حکم دے تو بھی اسے ماننا پڑے۔

اسی طرح تمہارا امیر کوئی خلافِ شریعت حکم دے تو آپ کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ نہ سنیں گے اور نہ مانیں گے! اور اگر کوئی امیر اس بات پر پوری طرح سے جم جائے اور مصر ہو تو پھر آپ اس جماعت کو چھوڑیں اور کوئی دوسری جماعت ڈھونڈیں یا آپ خود جماعت بنائیں‘ لیکن جماعت کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَاِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ، فَاِنَّ**

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الجهاد‘ باب ما جاء لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔

الشَّيْطٰنَ مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْاِثْنَيْنِ اَبْعَدُ))(۱) ''تم پر جماعت کی شکل میں رہنا فرض ہے' اور تم تنہا مت رہو' اس لیے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے' لیکن اگر دو (مسلمان) ساتھ رہیں تو وہ دور ہو جاتا ہے''۔

یہ ہے اللہ کے تقویٰ کے ساتھ' سمع وطاعت کا نظام اور اس کا حکم سورۃ التغابن کے آخر میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''تو تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنی حدِ امکان تک' اور سنو اور اطاعت کرو!''

حبشی غلام کی اطاعت بھی لازم ہے اگر وہ حاکم بن جائے

آگے ایک اہم نازک مسئلہ آ رہا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ)) ''چاہے تم پر کوئی حبشی غلام ہی حکمران بن بیٹھے (تو اس کی اطاعت بھی تم پر لازم ہے)''۔ یہ اس اعتبار سے ذرا نازک مسئلہ ہے کہ یہاں لفظ تَاَمَّرَ آیا ہے۔ اس کو سمجھ لیجیے۔ ایک ہے بابِ تفعیل اور ایک ہے بابِ تفعل' ان میں فرق ہے۔ مثلاً تعلیم (بروزنِ تفعیل) کا معنی ہے کسی کو علم سکھانا' اور تعلّم (بروزن تفعُّل) کا معنی ہے خود علم حاصل کرنا۔ مادہ ایک ہی ہے لیکن باب تبدیل ہونے سے معنی میں نمایاں فرق ہو گیا۔ اسی طرح اَمَّرَ' يُؤَمِّرُ تَاْمِيْرًا (تفعیل) کا معنی ہے کسی کو امیر بنانا اور تَاَمَّرَ' يَتَاَمَّرُ تَاَمُّرًا (تفعّل) کا معنی ہے خود امیر بن جانا۔ زیرِ مطالعہ حدیث میں لفظ تَاَمَّرَ آیا ہے' اس اعتبار سے معنی یہ ہوگا کہ اگر کوئی حبشی غلام اپنی قوت اور طاقت کے بل بوتے پر خود امیر بن جائے تو بھی اس کی اطاعت لازم ہے۔ یہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔(۲)

(۱) سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ما جاء فی لزوم الجماعة۔

(۲) حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی زیرِ مطالعہ روایت حافظ ابن قیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' (۱۱۹/۴) میں اور حافظ منذریؒ نے ''الترغیب والترھیب'' (۶۰/۱) میں درج کی ہے اور علامہ البانیؒ نے ''صحیح الترغیب والترھیب'' میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ امام نوویؒ نے اپنی ''اربعین'' میں اسے ترمذی اور ابوداؤد کے حوالے سے درج کیا ہے۔ لیکن ترمذی اور ابوداؤد کے علاوہ سنن ابن ماجہ' مسند احمد اور سنن دارمی میں بھی عرباض بن ساریہؓ کی روایت ◀

ایک تو ہے اسلام کا آئیڈیل نظام۔ اس میں تو امارت مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہوگی۔ اب کوئی نبی نہیں آئے گا' لہٰذا مسلمانوں میں سے ہی کسی کو اپنا امیر بنانا ہے تو اس کے لیے مشورہ ہوگا اور امیر کے انتخاب کے بعد اس کے ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ بعض لوگ بیعت اور الیکشن کو گڈمڈ (confuse) کرتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بالکل مختلف ہیں۔ الیکشن مشورے کے قائم مقام ہے جبکہ بیعت مشورے کے بعد ہے۔ جیسے ثقیفہ بنی ساعدہ میں پہلے مشورہ ہوا۔ انصار نے کہا کہ اسلام کو عزت اور غلبہ ہماری مدد سے ہوا ہے' لہٰذا خلافت ہمارا حق ہے۔ لیکن عرب تو قریش کے سوا کسی کی سیادت کو نہ جانتے تھے اور نہ مان سکتے تھے۔ تو پھر نظم کیسے قائم ہوگا؟ جب اس صورتِ حال کی اطلاع ملی تو حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما فوری طور پر وہاں پہنچے کہ کہیں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ ہو جائے اور ایک دفعہ اگر بیعت منعقد ہو گئی تو پھر اس کو ختم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس لیے جلدی آئے — اہلِ تشیع ان دونوں (صاحبین) پر الزام لگاتے ہیں کہ ابھی حضور ﷺ کی تدفین نہیں ہوئی اور یہ لوگ وہاں خلافت کے مشورے کے لیے آ گئے۔ دوسری طرف حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما جو آپؐ کے قریبی اعزّہ اور رشتہ دار تھے' وہ تجہیز و تکفین کے معاملے میں لگے ہوئے تھے — وہاں پر حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پیش کی گئی: ((اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ))(۱) چنانچہ

◀ جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے ان میں ''تأمَّر علیکم'' کے الفاظ شامل نہیں ہیں' بلکہ ''اِنْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ'' اور ''اِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا'' جیسے الفاظ آئے ہیں' یعنی امیر حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو' اس کا حکم سننا اور ماننا ضروری ہے۔ تاہم امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث مبارک ((وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ يَقُوْدُكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْا)) کے ذیل میں لکھا ہے کہ ''ایک غلام اگر غلبہ حاصل کر کے از خود امیر بن بیٹھے اور امورِ سلطنت کتاب وسنت کے مطابق انجام دے تو اس کی اطاعت لازم ہے۔ البتہ عام حالات میں جبکہ امیر کا انتخاب مسلمانوں کی آزادانہ رائے سے ہو رہا ہے' کسی غلام کو امیر منتخب کرنا درست نہیں ہوگا''۔ (حاشیہ از مدیر)

(۱) المعجم الاوسط للطبرانی: ۲۶/۴ و ۲۵۷/۶۔ السنن الکبریٰ للبیھقی: ۱۴۴/۸۔

مشورے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا گیا اور پھر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مشورے سے نامزد کیا تھا اور پھر بیعت ہوئی تھی۔

امامت متغلّب کا معاملہ

یہ تو ہے اسلام کا آئیڈیل نظام کہ مسلمانوں کی مشاورت سے امیر منتخب ہوگا' لیکن اگر ایک شخص خود اپنی طاقت سے زبردستی امیر بن جاتا ہے تو آیا اس کی اطاعت بھی لازم ہے یا نہیں؟ اصطلاح میں اس کو ''امامت متغلّب'' کہا جاتا ہے' یعنی خود غلبہ لے لینا' طاقت کے بل پر خود قابض ہو جانا ـــــ امامت متغلّب جائز ہے یا نہیں' اور پھر ایسے امام کی اطاعت لازم ہے یا نہیں؟ فقہاء اور ائمہ حدیث کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ چاہے کوئی زبردستی اپنی طاقت کے بل بوتے پر امیر بن بیٹھے تو جب تک وہ اللہ اور رسول کے احکام کے مطابق حکم دے تو اس کی اطاعت لازم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی بنا پر اسلامی جماعت میں دورِ خلافت راشدہ کے بعد بھی نظم قائم رہا۔

خلافت راشدہ کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی قوت کے بل بوتے پر خلیفہ بنے ہیں' جبکہ لوگوں کے مشورے سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موت کا وقت جب قریب آیا تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا ہم آپ کے بعد حسنؓ کو خلیفہ بنا لیں؟ انہوں نے کہا: نہ میں روکتا ہوں اور نہ میں اس کا حکم دیتا ہوں' یہ تمہارا معاملہ ہے اور تم اسے باہمی مشورے سے طے کر لو۔ مشورہ ہوا اور حضرت حسنؓ خلیفہ بن گئے۔ دوسری طرف امیر شام حضرت امیر معاویہؓ فوج لے کر آ گئے اور خانہ جنگی کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے جنگ صفین میں ۷۴ ہزار اور جنگ جمل کی ایک رات میں دس ہزار مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اب بھی جنگ کا خدشہ پیدا ہوا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ مصلحت سے کام لیتے ہوئے خلافت سے دستبردار ہو گئے اور خلافت حضرت معاویہؓ کے حوالے کر دی۔ اسی وجہ سے آپ کو خلیفہ راشد نہیں کہا جاتا کہ وہ لوگوں کے مشورے سے نہیں' بلکہ اپنی قوتِ بازو اور طاقت کے بل پر خلیفہ بنے تھے۔ لیکن یہ صورت بھی جائز ہے'

حرام نہیں ہے۔ (اس پر تفصیلی گفتگو آگے ہوگی۔)

نسلی تعصّبات کا مکمل خاتمہ ممکن نہیں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم پر کوئی حبشی غلام بھی حکمران بن جائے تو اس کی اطاعت بھی تم پر لازم ہے۔ اس میں دو باتیں ہیں: (۱) غلام ہونا' اور (۲) حبشی ہونا۔ ظاہر بات ہے کہ غلام کا درجہ کسی طور پر بھی آزاد کے برابر نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کہ اگرچہ اسلام نے رنگ و نسل کے سارے امتیازات ختم کر دیے تھے' مگر پھر بھی عربوں کے ہاں کچھ نہ کچھ نسلی تعصب موجود تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تربیت اور تزکیہ فرمایا اور وہ مساواتِ انسانی کے پوری طرح قائل تھے' لیکن اُس دور میں بھی اِکا دُکا واقعات ایسے رونما ہو جاتے جن سے نسلی تعصب کی بو آتی ـــ چنانچہ ایک عرب صحابی نے ایک حبشی صحابی سے جھگڑتے ہوئے غصے میں آ کر کہہ دیا: يَا ابْنَ السَّوْدَاء ''اے سیاہ فام عورت کے بیٹے!'' حضور ﷺ نے سنا تو فرمایا: ((اِنَّكَ امْرُؤٌ فِيْكَ جَاهِلِيَّةٌ))(۱) ''تم ایسے شخص ہو جس میں ابھی جاہلیت کے اثرات موجود ہیں!''

الغرض اسلام آنے کے بعد بھی بعض لوگ حبشیوں کو کمتر سمجھتے تھے اور یہ نسلی تعصب مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکا۔ آج امریکہ میں بھی رنگ و نسل کا یہ فرق ختم نہیں کیا جا سکا' حالانکہ وہ تعلیم و تعلم' تہذیب و تمدن' معاشرت اور قانون کے اعتبار سے انتہا پر سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں رنگ کی بنیاد پر کسی کو discriminate کرنا بہت بڑا جرم ہے' لیکن اس سب کے باوجود رنگ و نسل کی منافرت آج بھی ان میں موجود ہے اور گورے حبشیوں کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ کچھ ملی احساسات ہوتے ہیں جو انسانی فطرت میں اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ ان میں کمی تو آ سکتی لیکن مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا حضور اکرم ﷺ نے امیر کی اطاعت کے حوالے سے انتہائی بات فرمائی کہ کوئی حبشی غلام بھی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اگر حکمران بن بیٹھے اور وہ خلافِ شریعت کوئی حکم نہ دے تو اس کی اطاعت بھی تم پر لازم ہے۔

(۱) غاية المرام للالبانی' ح:۳۰۷۔ راوی: ابوذر الغفاری رضی اللہ عنہ۔

غلام بھی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اگر حکمران بن بیٹھے اور وہ خلافِ شریعت کوئی حکم نہ دے تو اس کی اطاعت بھی تم پر لازم ہے۔

فاسق و فاجر حکمران کے خلاف بغاوت

اکثر فقہاء کی رائے تو یہی ہے کہ امامت متغلب جائز ہے اور اس کی اطاعت بھی لازم ہے‘ البتہ فاسق و فاجر حکمران کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ اس کے خلاف بغاوت کی جاسکتی ہے۔ باقی فقہاء کے نزدیک فاسق و فاجر حکمران خواہ اپنے محل کی چار دیواری میں رنگ رلیاں منا رہا ہے یا اور کچھ کر رہا ہے‘ لیکن وہ نماز قائم کر رہا ہے‘ جمعہ‘ جماعت اور حج کا سارا انتظام کر رہا ہے تو اس کی اطاعت کرو‘ البتہ اگر وہ کفر کا حکم دے تو پھر اس کے خلاف کھڑے ہو جاؤ‘ اس لیے کہ اس کے بعد معاملہ ایک حد سے تجاوز کر جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ فاسق و فاجر شخص کے خلاف اس وقت بغاوت ہوسکتی ہے جب اس پر کوئی نصیحت اثر نہ کر رہی ہو۔ پہلے امر بالمعروف و نہی عن المنکر زبان سے کیا جائے‘ دیکھو باز آ جاؤ‘ ان چیزوں کو چھوڑ دو‘ لیکن اگر وہ باز نہیں آ رہا اور اس نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھا رہا تو پھر نہی عن المنکر تلوار کے ذریعے سے ہوگا۔ البتہ بغاوت اور مسلّح جدّوجُہد کی صورت میں امام ابوحنیفہ یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ طاقت اتنی ہونی چاہیے کہ کم از کم ظاہری حالات و اسباب کے مطابق کامیابی یقینی ہو جائے۔ یہ نہیں کہ تھوڑے سے لوگ جمع ہو کر بغاوت کا نعرہ لگا دیں اور پھر سب کے سب کچل دیے جائیں۔ لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ ملوکیت کے نظام میں اتنی طاقت فراہم ہو جانا‘ ناممکن ہے۔

کثرتِ اختلاف کا زمانہ

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَإِنَّهُ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا)) ’’پس جو بھی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ یقیناً بہت سارے اختلافات دیکھے گا‘‘۔ اب یہ اختلافات کئی طرح کے ہوسکتے ہیں۔ ایک تو رائے کا اختلاف ہوتا ہے‘ جیسے حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے اختلاف کیا کہ مانعین

زکوٰۃ کے خلاف آپ اقدام نہ کریں۔ دو محاذ تو پہلے ہی کھلے ہوئے ہیں۔ آپؓ نے جیش اسامہؓ بھی روانہ کر دیا ہے۔ چونکہ وہ لشکر حضور ﷺ نے تیار کیا تھا اور آپ نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ پھر ظاہر بات ہے کہ جھوٹی نبوت کے دعوے داروں کے خلاف جنگ بھی کرنی ہی کرنی ہے‘ لیکن جن لوگوں نے صرف زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ہے وہ کافر تو نہیں ہوئے۔ اصل میں انہوں نے زکوٰۃ کا انکار نہیں کیا تھا‘ بلکہ ان کا موقف یہ تھا کہ ہم زکوٰۃ خود لیں گے‘ خود تقسیم کریں گے اور حکومت کو نہیں دیں گے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ ڈٹے رہے اور آپؓ نے فرمایا: أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَاَنَا حَيٌّ ؟ (۱) کیا دین میں کمی کی جائے گی جبکہ میں ابھی زندہ ہوں؟‘‘ میرے جیتے جی یہ نہیں ہوسکتا۔ خدا کی قسم! اگر حضور ﷺ کے زمانے میں یہ لوگ زکوٰۃ کی مد میں اونٹوں کے ساتھ ان کو باندھنے والی رسیاں بھی دیتے تھے اور اب اگر یہ کہیں کہ یہ اونٹ لے جاؤ اور عقال ہم نہیں دیں گے تب بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔ اونٹ کے مقابلے میں عقال کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں‘ لیکن حضرت ابوبکرؓ کو دین میں اتنی ترمیم بھی گوارا نہیں تھی۔

یہ تو رائے کا اختلاف تھا‘ جبکہ بعد میں مسلمانوں میں سیاسی نوعیت کے اختلافات بھی ہوئے اور یہ اختلافات شدید نوعیت کے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت پر زبردست اختلاف پیدا ہوا۔ مدینے کے لوگ‘ جن میں ایک بڑی تعداد بلوائیوں کی تھی اور جنہوں نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا تھا‘ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور حضرت علی خلیفہ مقرر ہو گئے۔ دوسری طرف بہت سے صحابہ کرامؓ نے ان کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ حضرت امیر معاویہؓ‘ حضرت عمرو بن العاصؓ‘ حضرت زبیرؓ‘ حضرت طلحہؓ اور حضور ﷺ کی زوجہ محترمہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہم) نے کہا کہ پہلے آپ قاتلینِ عثمانؓ کو سزا دیں‘ پھر ہم آپ کی بیعت کریں گے۔ اس کے علاوہ ہمیں آپ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بہرحال یہ اختلاف بڑا شدید ہوا اور جنگ جمل ہوئی‘ جس میں ایک رات میں دس ہزار مسلمان قتل ہوئے۔ اس کے

(۱) تخریج مشکاۃ المصابیح لابن حجر العسقلانی : ۳۹۷/۵

بعد حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ شام اور مصر کی فوجوں کو لے کر آئے اور پھر جنگ صفین جیسا بہت بڑا معرکہ ہوا جس میں ۷۴ ہزار مسلمان ختم ہوئے۔ پھر وہیں سے خوارج کا ایک فرقہ نمودار ہوا اور ان کے خلاف حضرت علیؓ نے جنگ کی تو چار ہزار خوارج جنگ نہروان میں ختم ہو گئے۔ اس طرح حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لے کر حضرت علیؓ کی شہادت تک تقریباً ایک لاکھ مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں اور نیزوں سے شہید ہوئے۔

پھر ہمارے ہاں فقہی اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ مختلف مکاتب فکر کے اصول فقہ مختلف ہو گئے۔ اہلِ علم کے مابین یہ اختلاف بھی پیدا ہوا کہ قرآن وسنت سے مستنبط ہونے والی رائے کو ترجیح دی جائے گی یا خبر واحد کو؟ اس پر ہمارے ہاں پورے دو مسلک بن گئے۔ ایک ''اصحاب الرائے'' کہلاتے ہیں' جن کے سرخیل امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور ایک ''اصحاب الحدیث'' کہلاتے ہیں جن کے سرخیل امام مالک' امام شافعی اور پھر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ اصحاب الحدیث اخبار احاد کو' جبکہ اصحاب الرائے ان کے مقابلے میں قرآن حکیم اور پختہ احادیث کی روشنی میں قائم ہونے والی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مابین بہت سے فقہی معاملات میں اختلاف ہو گیا۔

زمانۂ اختلاف میں راہِ عمل

جب یہ اختلافات ہو جائیں گے تو اب کیا کیا جائے؟ اس ضمن میں یہ بڑا اہم اصول آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) ''پس (ان حالات میں) میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت (طریقہ) کو لازم پکڑو'' ((تَمَسَّكُوْا بِهَا)) ''اس کو مضبوطی سے تھامو'' ((وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) ''اور اسے داڑھوں سے قابو کرنا''۔ یعنی اتنی مضبوطی سے پکڑنا کہ گرفت ڈھیلی نہ پڑے۔

اس جملہ میں لفظ ''راشدین'' آیا ہے' اس کا مفہوم سمجھ لیجیے —— قرآن مجید میں انسان کی کامیابی کے لیے تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ زیادہ تر لفظ ''فلاح''

استعمال ہوا ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ' جبکہ بعض مواقع پر لفظ ''فوز'' بھی استعمال ہوا ہے: ﴿اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ یعنی کامیابی یا کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جانا' یہ فوز ہے۔ فَائِزُوْن کے مقابلے میں مُفْلِحُوْنَ بہت زیادہ گھمبیر لفظ ہے۔ فلاح روحانی بھی ہے اور اخلاقی بھی۔ انسان کا ایک ''حیوانی وجود'' ہے اور ایک اس کے اندر چھپا ہوا ''روحانی وجود'' ہے اور وہ انا' خودی یا روح ہے۔ آپ کی ساری توجہ حیوانی ضروریات پر ہے جبکہ روح بیچاری سسک رہی ہے' بھوکی ہے' پیاسی ہے اور اسے آپ نے کوئی غذا ہی نہیں دی۔ اس کی غذا تو اللہ کا کلام ہے' اس لیے کہ روح تو امر ربی ہے — ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ (الاسراء:۸۵) ''(اے نبی ﷺ!) وہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کا امر ہے'' — اس 'امرِ رب' کے لیے 'کلامِ رب' ضروری ہے۔ دیکھئے' یہ جسدِ حیوانی جہاں سے آیا ہے وہیں سے اس کی غذا بھی آ رہی ہے۔ یہ جسم مٹی سے بنا — ﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾ ''اُس نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے'' — تو اس تراب ہی سے ہماری گندم بھی آ رہی ہے' چاول بھی آ رہے ہیں' ہماری سبزیاں بھی آ رہی ہیں۔ ہم جانوروں کا گوشت بھی کھاتے ہیں اور وہ بھی سبزیوں سے' گھاس سے' چارے سے بنا ہے۔ الغرض خوراک اور ہماری باقی جسمانی ضروریات کا اصل ذریعہ یہ مٹی ہی ہے۔

اس کے برعکس روح کا تعلق امر رب سے ہے تو اسے غذا بھی کلامِ رب اور ذکر رب سے حاصل ہو گی۔ اور فلاح کا مطلب ہی یہ ہے کہ حیوانی وجود کو پھاڑ کر اس کے اندر سے باطنی شخصیت کو برآمد کیا جائے۔ جیسے زمین پھٹتی ہے تو اس میں سے بیج کی دو پتیاں نکلتی ہیں' جس کے لیے فلق کا لفظ آیا ہے' جو فَلَح کا ہم معنی ہے۔ کسان اور کاشت کار کے لیے فلّاح کا لفظ استعمال ہوا ہے' اس لیے کہ وہ بھی اپنے ہل کی نوک سے زمین کو پھاڑتا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے اپنے اندر سے اپنے حقیقی وجود کو نکال کر پروان چڑھایا' وہی مُفلِحُون ہیں۔

''رُشد'' روحانی اعتبار سے سب سے اونچا مقام

انسانی کامیابی کے لیے قرآن مجید میں تیسرا لفظ رُشد استعمال ہوا ہے اور یہ روحانی اعتبار سے سب سے اونچا مقام ہے' گویا انسان اپنے منتہائے مقصود کو پہنچ جائے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں صرف دو مرتبہ آیا ہے۔ ایک تو سورۃ الحجرات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں آیا ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴾

''لیکن اللہ نے تمہارے دلوں کے اندر محبوب ترین شے ایمان کو بنا دیا اور اسے مزین کر دیا تمہارے دلوں میں اور بہت ہی ناپسندیدہ بنا دیا اللہ نے تمہارے نزدیک کفر کو' فسق کو اور گناہ کو۔ یہی ہیں وہ لوگ جو رشد کو پہنچ جانے والے ہیں۔''

دوسری مرتبہ یہ لفظ سورۃ البقرۃ میں آیا ہے جہاں روزے کے احکام اور حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔ روزے کا اصل حاصل اور اس کا نقطہ عروج روحِ انسانی کو غذا پہنچانا اور جسم انسانی کو ذرا مضمحل کرنا ہے۔ بھوک' پیاس برداشت کرو تا کہ تمہارا جسم ذرا مضمحل ہو جائے۔ جب یہ حیوانی وجود مضمحل ہوگا تو اس روحانی وجود کو ریلیف ملے گا جو اس کے اندر دبا ہوا ہے اور دبے ہونے کی وجہ سے گویا سسک رہا ہے یا تقریباً بے ہوش ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس کے اوپر قرآن کی بارش کرو اور رات کو قیام کرو۔ چنانچہ روزے کے ذریعے سے آپ نے جسم کو دبایا اور روح کو اٹھایا ہے تو اس سے جو مقام حاصل ہوگا وہ روحانی اعتبار سے بلند ترین مقام ہے' اسی لیے اس کے لیے لفظ ''رشد'' آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶﴾

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ انہیں بتا دیں کہ) میں تو بالکل قریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں (اور قبول کرتا ہوں)' پس چاہیے کہ وہ مجھے پکاریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا کہ وہ رشد کو پہنچ جائیں۔''

ظاہر بات ہے کہ انسان کے اندر جب حقیقی ایمان پیدا ہوتا ہے تو اللہ کا قرب حاصل کرنے کی ایک طلب سی ہوتی ہے اور اللہ کو دیکھنے کی بڑی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہی اصحابِ جنت کو ملنے والی سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اسی دیدار کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی: ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ﴾ ''پروردگار! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں''۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ﴾ ''تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے''۔ یعنی اس عالمِ مادی میں رہتے ہوئے تم میرا دیدار نہیں کر سکتے اور میری تجلیات کو برداشت کرنے کی تم میں طاقت نہیں ہے۔ تم ذرا سامنے کے پہاڑ کو دیکھو' ہم اس پر اپنی ایک تجلی ڈالیں گے' اگر ہماری ایک تجلی کو وہ پہاڑ جھیل جائے تو پھر تم بھی ہمیں دیکھ سکو گے۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ (الاعراف:۱۴۳) ''پھر جب اُس کے رب نے اپنی ایک تجلی پہاڑ پر ڈالی تو وہ پہاڑ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے''۔ تجلیٔ باری تعالیٰ کے اس بالواسطہ مشاہدے کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام برداشت نہ کر سکے۔ پہاڑ پر تجلی کا پڑنا تھا کہ آپؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لیکن آخرت میں اصحابِ جنت کو جو آخری نعمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی وہ اللہ کا دیدار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنا دیدار نصیب فرمائے۔ آمین!

رہبانیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں!

تاریخ انسانی کا مطالعہ کرنے والوں کے علم میں ہے کہ لوگ اپنے رب کو پانے کے لیے ہی پہاڑوں میں بیٹھتے تھے' مراقبے کرتے تھے' غاروں میں نفس کشی کی ریاضتیں کرتے تھے۔ عیسائیوں کے اندر تو نفس کشی کی انتہا ہوئی ہے اور قرآن مجید میں ان کے اوپر تنقید بھی کی گئی ہے: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ِۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ (الحدید:۲۷) کہ رہبانیت کی بدعت انہوں نے خود ایجاد کی' جبکہ ہم نے ان پر یہ لازم نہیں کی تھی۔ اپنے نفس کو مارنے کا حکم اللہ نے نہیں دیا ہے۔ نفس کا بھی حق ہے' اسے ادا کرو' یہ نہیں ہے کہ اسے کچل دو' اسے ختم کر دو۔ ہاں نفس کے تابع نہ ہو جاؤ بلکہ اپنے نفس کو اللہ کے احکام

کے تابع کر دو۔ یہ ہمارا نفس‘ ہمارا حیوانی وجود ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے۔ یہ ہاتھ‘ یہ پاؤں‘ یہ آنکھیں‘ یہ کان‘ یہ ناک‘ یہ زبان‘ یہ ساری چیزیں ہمارے پاس اللہ کی امانت ہیں اوران کا بھی حق ہے جن کو ادا کرنا ہم پر لازم ہے اور کل قیامت کے دن اس بارے میں ہم سے سوال ہوگا۔

میں نے بارہا آپ کو بتایا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما پوری رات بستر پر کمر لگاتے ہی نہیں تھے اور ہر روز روزہ رکھتے تھے‘ بیوی سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ وہ خود روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپؐ نے مجھے بلا کر (ذرا تیکھے انداز میں) دریافت فرمایا: ((اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّكَ تَقُوْمُ اللَّيْلَ وَتَصُوْمُ النَّهَارَ؟)) ’’کیا مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ تم رات بھر قیام کرتے ہو اور روزانہ دن کو روزہ رکھتے ہو؟‘‘ میں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ، قُمْ وَنَمْ، وَصُمْ وَاَفْطِرْ، فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا.....)) [1] ’’تو ایسا مت کرو‘ (رات کو) قیام بھی کیا کرو اور سویا بھی کرو‘ اور روزے رکھا بھی کرو اور چھوڑ بھی دیا کرو‘ اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے‘ تمہاری آنکھ (نیند) کا بھی تم پر حق ہے‘ تمہارے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے۔ اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے.....‘‘ گزشتہ حدیث میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ بندۂ مؤمن کا اپنی بیوی سے ہم بستری کرنا بھی باعث ثواب ہے۔ ہمارے سارے حیوانی اعمال عبادت بن جاتے ہیں جب اللہ کے حکم کے تابع اور اللہ کی حدود یعنی حلال وحرام کے دائرے میں ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جو تمہاری زیارت اور ملاقات کے لیے آیا ہے تو اس کا بھی تم پر حق ہے‘ لہٰذا اس سے بھی خوشدلی کے ساتھ ملو۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ((تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ)) [2] ’’تمہارا اپنے بھائی سے متبسم چہرے کے ساتھ ملنا بھی صدقہ ہے‘‘۔ یعنی اللہ کے ہاں اس کا بھی

(۱) صحيح البخاری‘ كتاب النكاح‘ باب لزوجك عليك حق۔

(۲) سنن الترمذی‘ ابواب البر والصلة والآداب‘ باب ماجاء فی صنائع المعروف۔

اجر ملے گا۔ یہ نہیں کہ آپ ’’عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا‘‘ بن جائیں اور وہ بھی پریشان ہو رہا ہو کہ میں خواہ مخواہ اس سے ملنے کے لیے آ گیا ہوں۔

خلفائے راشدین میں کون کون شامل ہے؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کثرتِ اختلاف کے دور میں میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت (طریقہ) کو لازم پکڑو۔ اس ضمن میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ خلفائے راشدین میں کون کون شامل ہے؟ حضرات ابوبکر‘ عمر‘ عثمان اور علی رضی اللہ عنہم پر اہلِ سنت کا تو اجماع ہے‘ جبکہ اہلِ تشیع پہلے تین کو نہیں مانتے۔ ان میں سے جو غالی قسم کے گروہ ہیں وہ پہلے تین خلفاء کو غاصب کہتے ہیں اور جو ذرا مائل قسم کے ’’زیدی شیعہ‘‘ ہیں وہ غاصب تو نہیں کہتے‘ لیکن ان کی رائے یہ ہے کہ حق بہرحال حضرت علیؓ ہی کا تھا کیونکہ وہ تمام صحابہ میں افضل ہیں‘ جبکہ اہل سنت کے نزدیک انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد پوری انسانیت میں افضل ترین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں‘ اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ‘ پھر حضرت عثمان غنی اور پھر حضرت علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علیؓ باقی پوری نوعِ انسانی سے افضل ہیں‘ لیکن یہ تین حضرات ان سے افضل ہیں۔

یہ چاروں حضرات تو بالاتفاق خلفائے راشدین ہیں‘ جبکہ کچھ لوگ اس میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔ میں بھی سمجھتا ہوں کہ حضرت حسنؓ کو بھی خلفائے راشدین میں شمار کیا جانا چاہیے‘ اس لیے کہ وہ صحابی بھی ہیں اور ان کی بہت فضیلت احادیث میں بیان ہوئی ہے — آپؓ کا شمار صغار صحابہ میں ہوتا ہے اور آپ حضور ﷺ کی گود میں پلے بڑھے ہیں۔ عین نماز کی حالت میں حضور ﷺ کے کندھوں پر سواری کی ہے۔ یہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سجدے کی حالت میں حضور ﷺ کی پیٹھ پر چڑھ کر بیٹھ جاتے تو آپ ﷺ کبھی سجدہ لمبا کر دیتے اور کبھی بڑے ہی آرام سے انہیں نیچے اتارتے تھے۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما میرے باغ کے دو پھول ہیں — دوسری بات یہ ہے کہ حضرت حسنؓ نے خود اپنی طاقت سے خلافت حاصل نہیں کی‘ بلکہ وہ باہمی مشاورت سے منتخب ہوئے ہیں‘ لہٰذا انہیں بھی خلفائے راشدین المہدیین میں شامل کیا جانا چاہیے۔

البتہ امیر معاویہؓ کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ہمارے ہاں بعض انتہا پسند لوگ حضرت

امیر معاویہؓ کو بھی خلیفہ راشد کہتے ہیں‘ اس لیے کہ وہ بھی صحابی ہیں‘ لیکن اہل سنت نے ان کو اس طور سے تسلیم نہیں کیا‘ اس لیے کہ وہ متغلب ہیں۔ انہیں کسی نے نہیں چنا اور نہ ان کے لیے کوئی مشاورت ہوئی تھی۔ وہ تو حضرت حسنؓ نے مسلمانوں میں خونریزی اور باہمی جنگ وجدل روکنے کے لیے دستبرداری اختیار کر کے خلافت امیر معاویہؓ کے سپرد کر دی تھی۔ حضور ﷺ نے حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا تھا: ((اِبْنِی هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ))(۱) ’’یہ میرا بیٹا سید ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرا دے گا‘‘۔ اس سال کو عام الصُّلح (صلح کا سال) اور عام الاَمن (امن کا سال) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد بیس برس تک حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت رہی۔

حضرات ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور حسنؓ ان پانچوں حضرات کے دورِ خلافت کو جمع کیا جائے تو تیس سال بنتے ہیں اور اس میں حضرت حسن کے دورِ خلافت کے بھی چھ مہینے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَلْخِلَافَةُ بَعْدِیْ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا))(۲) ’’میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی‘ پھر ملوکیت کا آغاز ہو جائے گا‘‘۔ حضرت امیر معاویہؓ کا دور ملوکیت کا آغاز ہے‘ لیکن ابھی ملوکیت کی ساری خرابیاں اس میں نہیں آئی تھیں۔ ملوکیت کی خرابیاں بعد میں بنواُمیہ کے خلفاء میں آئیں اور بنوعباس کے دور میں اس میں مزید اضافہ ہوا۔ ان کے دور میں محلات بنے اور دنیوی کروفر اور شان وشوکت‘ جو شہنشاہوں میں ہوا کرتی تھی وہی خلفاء بنوعباس نے اختیار کی۔

امیر سے اختلاف اور تنازع کی صورت میں فیصلہ کون کرے گا؟

سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کے الفاظ: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ ’’اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان تنازع ہو جائے تو لوٹا دو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف‘‘ ـــــ میں ایک بات تو واضح ہے کہ اختلاف کی صورت میں

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

(۲) صحیح ابن حبان‘ ح: ۶۹۴۳۰۔ جامع بیان العلم للامام احمد: ۱۱۶۹/۲ راوی: سفینہ ؓ

فیصلہ کن وہی دو مطلق اطاعتیں ہوں گی‘ یعنی اللہ کی اطاعت اور رسول ﷺ کی اطاعت۔ تاہم اس ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امیر اور مامور میں کسی تنازع کی صورت میں اللہ اور رسول کی طرف کون لوٹائے گا‘ یعنی کون فیصلہ کرے گا کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ یہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ فرض کیجیے اگر تو دو مسلمانوں میں کوئی تنازع ہے تو امیر المؤمنین طے کرا دے‘ لیکن اگر مسلمانوں کو اپنے امیر سے ہی اختلاف ہو گیا تو اس صورتِ حال میں کیا کریں گے؟ خلافت راشدہ کے دور میں تو اس کے ضمن میں کوئی ادارہ (institution) موجود نہیں تھا۔ اگرچہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے بیعت خلافت کے فوراً بعد اپنے خطاب میں کہا تھا کہ اگر میں اللہ اور اس کے رسول کے راستے پر چلوں تو تم پر میری اطاعت فرض ہے اور اگر میں ٹیڑھا ہونے لگوں یا غلط راستے پر چلوں تو مجھے سیدھا کرنا تم پر فرض ہے۔ اب سیدھا کیسے کریں؟ اس کا وہاں کوئی طریق کار طے نہیں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خلفائے راشدین اس پہلو سے مستثنیٰ ہیں‘ اس لیے کہ وہ حضور ﷺ کے انتہائی قریبی ہیں‘ لیکن بعد کے دور میں یہ کام عدلیہ (judiciary) کے ادارے کا ہے اور اب یہ فیصلہ عدلیہ کرے گی۔

آج کے دور میں یہ معاملہ بہت واضح ہو کر سامنے آ گیا ہے کہ ریاست کے تین بنیادی ستون ہیں۔ (اگرچہ چوتھا بعد میں شامل کر دیا گیا ہے‘ لیکن اصل میں تین ہی ہیں۔) ایک انتظامیہ ہے جو حکم دیتی ہے‘ ایک مقنّنہ ہے جو قانون بناتی ہے اور ایک عدلیہ ہے‘ جس کی اہمیت سب سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے ایک ایگزیکٹو آرڈر آیا ہے‘ اس کے خلاف ایک شخص کھڑا ہو جاتا ہے کہ یہ تو آئین اور دستور (constitution) کے خلاف ہے‘ ہم اس ایگزیکٹو آرڈر کو نہیں مانیں گے۔ اس صورت میں آپ آئینی عدالتوں (constitutional courts) یا سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ پھر وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط!

ہمارے ہاں جنرل ضیاء الحق نے شریعت کورٹ بنا کر ایک درست راستہ اختیار کیا تھا‘ لیکن اس کے اوپر پابندیاں لگا دیں‘ دو ہتھکڑیاں اور دو بیڑیاں پہنا دیں تو وہ کام

بالکل بے کار ہو گیا۔ بہر حال راستہ صحیح تھا کہ عدلیہ فیصلہ کرے گی۔ اسی طریقے سے خاص شریعت کورٹ بنا دی جائیں اور وہ فیصلہ کریں کہ کون سی چیز اور کون سا قانون شریعت کے خلاف ہے۔

آخری وصیت: بدعت سے بچو!

زیر مطالعہ روایت کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے چوتھی وصیت یہ فرمائی: ((وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ)) ''اور دین میں نئی نئی باتیں نکالنے سے بچنا''۔ بدعت کے موضوع اربعین نووی کی حدیث ۵ کے ضمن میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں' لہٰذا یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ایک ہے قرآن اور سنت سے استنباط کر کے کوئی حکم نکالنا' اجتہاد کرنا' قیاس کرنا' تو یہ سب جائز ہیں' لیکن اگر آپ نے دین میں بالکل نئی بات نکال لی جس کی تائید میں نہ قرآن سے کوئی دلیل ملی اور نہ سنت سے تو وہ بدعت ہے۔ خاص طور پر عبادات کے اندر ثواب کمانے کے لیے کیے جانے والے کام' جس کی سند ہمارے پاس نہ قرآن میں ہے' نہ حدیث میں' نہ خلفائے راشدین کے عمل میں اور نہ صحابہؓ کے عمل میں تو وہ بدعت شمار ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ نے بدعت کے حوالے سے واضح فرما دیا کہ ((فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ)) ''پس (دین میں) ہر نئی بات یقیناً بدعت ہے''۔ ((وَکُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''(اور جان لو کہ) ہر بدعت یقینی طور پر گمراہی ہے'' ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ((وَکُلَّ ضَلَالَةٍ فِی النَّارِ)) ''اور ہر گمراہی کا ٹھکانہ آگ ہے!'' یا ''ہر گمراہی آگ میں لے جانے والی ہے!''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اس حدیث کے مندرجات پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس حدیث میں موجود حضور اکرم ﷺ کی وصیتوں کو اپنانے اور ان کے مطابق زندگی گزارنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: حافظ محمد زاہد' ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات)

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع!

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لیے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I,II,III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لیے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-35869501

Email: distancelearning@tanzeem.org

اِسلام اور ریاست

مفتی محمد تقی عثمانی

(جوابِ تحریر جاوید احمد غامدی بعنوان ''اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ'')

روزنامہ جنگ (۲۲ جنوری ۲۰۱۵ء) کے ادارتی صفحات پر معروف اسکالر جناب جاوید احمد غامدی کا ایک کالم ''اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ'' کے نام سے شائع ہوا' جس میں مسلمانوں کے ایک قوم یا امت کے تصور کی نفی کرتے ہوئے ایک ایسے اسلام کا تصور پیش کیا گیا ہے جو مغرب کے لیے تو قابلِ قبول ہو مگر اس کا اس اسلام سے تعلق نہ ہو جو ہم تک اللہ کی کتاب اور سنت رسولؐ کے ذریعے پہنچا اور جس کا عملی نمونہ ہمارے سامنے ریاست مدینہ کی شکل میں دورِ نبویؐ اور دورِ خلفائے راشدینؓ میں نظر آیا۔ اس کالم کے جواب میں اصحابِ علم وفضل کی بہت سی تحریریں روزنامہ جنگ اور دیگر اخبارات کے صفحات پر شائع ہوئیں۔ ان میں سے چند منتخب تحریریں یکجا کر کے نذرِ قارئین کی جارہی ہیں۔ (ادارہ)

غیر منقسم ہندوستان میں قائداعظم کی قیادت میں قیام پاکستان کی جو تحریک چلی' اس کی بنیاد مسلم قومیت کے نظریے پر تھی۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں جو تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم قرار دے کر اکھنڈ بھارت کے حق میں تھے' قائداعظم نے پورے زور وشور اور دلائل کی روشنی میں یہ نعرہ لگایا کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں' ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم۔ مسلمان رہنماؤں' اہل فکر اور علمائے کرام نے اس کی بھرپور تائید کی اور میرے بچپن میں ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ'' کی جو صدائیں گونجتی تھیں' ان کی دلکش یاد آج بھی کانوں میں محفوظ ہے۔ آخر کار مسلم اکثریت نے قائداعظم کی اس پکار پر لبیک کہا' اور ناقابلِ فراموش قربانیوں کے بعد ہمالیہ کے دامن میں ارضِ پاک ایک حقیقت بن کر اُبھری۔

نظریہ پاکستان کی بنیاد تو واضح تھی' لیکن ایک چھوٹا سا حلقہ پاکستان کی پہلی دستور ساز

اسمبلی نے دستور پاکستان کے لیے وہ قراردادِ مقاصد باتفاق منظور کی جس نے ملک کا رخ واضح طور پر متعین کر دیا کہ حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے' اور عوام کے منتخب نمائندے اپنے اختیارات قرآن وسنت کی حدود میں رہ کر استعمال کر سکیں گے' اور یہ قرارداد ۱۹۵۴ء' ۱۹۵۶ء' ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے تمام دستوری مسودوں کا' الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ لازمی جزو بنی رہی' اور آج بھی وہ ہمارے دستور کی وہ دستاویز ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ چوتھائی صدی تک بنتی ٹوٹتی اسمبلیوں میں بھی اور باہر بھی اس پر کھلے دل سے بحث ومباحثہ بھی ہوا' اور بالآخر اس پر پورے ملک کا اتفاق ہو گیا۔ پھر اس کی بنیاد پر دستور کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو یہ دفعہ بھی تمام مسوداتِ دستور میں کسی قابل ذکر اختلاف کے بغیر موجود رہی کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جا سکے گا اور موجودہ قوانین کو بھی ان کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ سن ۱۹۷۳ء کا دستور جو آج بھی نافذ ہے' اُس وقت کے تمام سیاسی اور دینی حلقوں کے اتفاق سے منظور ہوا' اور اس پر بفضلہٖ تعالیٰ آج بھی تمام سیاسی پارٹیاں متفق ہیں اور اس کا مکمل تحفظ چاہتی ہیں' جس کا مظاہرہ اور اس کی مزید تاکید حال ہی میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے تاریخی اتفاق سے دوبارہ ہو گئی ہے' اعلیٰ عدالتوں نے بھی اسے دستور کی بنیادی روح کا لازمی حصہ قرار دیا ہے۔

اب کچھ عرصے سے کچھ آوازیں پھر گونجنے لگی ہیں کہ ملک کو اس دہشت گردی سے پاک کرنے کے لیے اسے سیکولر بنانا چاہیے' یعنی نصف صدی سے زائد جو فکری' سیاسی اور عملی جدوجُہد ملک کا صحیح رخ متعین کرنے کے لیے ہوئی ہے' اس کی بساط لپیٹ کر پھر الف با سے آغاز کرنا چاہیے۔ ایک ایسے موقع پر جب ملک کے تمام طبقات دہشت گردی کے عفریت کو مل کر شکست دینے کے لیے کمربستہ ہیں' ملک کی بنیاد' اس کے قیام کے نظریے اور اس کے متفقہ رخ کو تبدیل کرنے کی کوشش اس فضا میں جو پنڈورا بکس کھول سکتی ہے' اور اس سے جو انتشار جنم لے سکتا ہے' اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

اسی فضا میں سیکولرازم کے حامی حضرات جو کچھ فرما رہے ہیں اس کی بازگشت مذہب کے نام پر ایک مذہبی بیانیہ کے عنوان سے سامنے آئی ہے' جو روزنامہ جنگ کے ۲۲ جنوری کے شمارے میں ''اسلام اور ریاست' ایک جوابی بیانیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے' جس میں انہوں نے ''سیکولرازم کی تبلیغ'' کے بجائے اپنے افکار کو ''مذہبی بیانیہ'' قرار دیا ہے۔ اس ''بیانیہ'' کا مقصد انہوں نے شروع ہی میں یہ بیان فرمایا ہے کہ ''سیکولرازم کی تبلیغ نہیں' بلکہ

مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورتحال کی اصلاح کر سکتا ہے۔''

اس جوابی بیانیہ (Counter narrative) کے جو نکات انہوں نے بیان فرمائے ہیں' ان کو بار بار پڑھنے کے باوجود مجھے شاید اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہ ایک عجوبے سے کم نہیں لگتے اور ان کے باہمی تضادات سے مجھے بہت سے تاویلات کے باوجود چھٹکارا نہیں مل سکا۔

اس مضمون میں یوں تو بہت سی باتیں قابلِ تبصرہ ہیں' لیکن ان تمام نکات پر تبصرہ بہت طول چاہتا ہے جس کا یہ مضمون متحمل نہیں۔ لیکن ان میں سے چند متضاد نکات اور ان کے مضمرات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے' کیونکہ وہ نکات نہ صرف پاکستان کے قیام کے نظریے ہی کی نفی کرتے ہیں' بلکہ ملک کو ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے نظامِ اجتماعی کی طرف دعوت دیتے ہیں جن کے عملی اطلاق کی کوئی معقول صورت کم از کم مجھ کم فہم کی سمجھ میں نہیں آسکی۔ سب سے پہلے نکتے میں انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے' اور اس کو بھی کسی قراردادِ مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔''

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے آئین میں جو قراردادِ مقاصد درج ہے' یا اس میں جو پابندی عائد کی گئی ہے کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا' یہ قطعی طور پر نہ صرف غیر ضروری' بلکہ بے بنیاد خیال پر مبنی ہے۔ قراردادِ مقاصد کا بنیادی تصور اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا اقرار ہے' اور اسے غیر ضروری اور بے بنیاد قرار دینے کا نتیجہ ریاست کے لیے اس حاکمیتِ اعلیٰ کے اقرار کو بے بنیاد قرار دینے کے سوا اور کیا ہے؟

یہ بیانیہ وہ ''سیکولرازم کی تبلیغ'' کے مقابلے میں یا اس کے متبادل کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ لیکن اوّل تو یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ''سیکولرازم کی تبلیغ'' اور ''مذہبی بیانیہ'' کے اس نکتے میں کیا فرق ہوا؟ سیکولرازم بھی یہی کہتا ہے کہ ''ریاست کا دین سے کوئی تعلق نہیں' کیونکہ دین ایک خالص انفرادی معاملہ ہے۔ وہ بھی یہی کہتا ہے کہ پارلیمان پر کسی دین کی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی' لہٰذا قراردادِ مقاصد کی کوئی ضرورت نہیں' اور یہی باتیں مضمون کے اس نکتے میں بھی ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ کیا عنوان بدل دینے سے حقیقت میں کوئی فرق آجاتا ہے؟ پھر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد آگے خود وہ نکتہ نمبر ۸ میں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ارشاد اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کا تقاضا ہے کہ ملک میں ایک پارلیمان قائم ہونی چاہیے' اور:

''علماء ہوں یا ریاست کی عدلیہ' پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہوسکتا۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ اس سے ہٹ کر جو حکومت قائم کی جائے گی' وہ ایک ناجائز حکومت ہوگی۔''

ان دونوں باتوں کے مجموعے سے مطلب یہی نکلتا ہے کہ پارلیمان وجود میں تو قرآنی حکم ''اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کے تحت آئے گی' مگر اس کے بعد اسے اس بات کا پابند نہیں کیا جاسکتا کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہ بنائے' البتہ ملک کے افراد اور ادارے اس بات کے پابند ہیں کہ وہ پارلیمان کے ہر فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیں۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ریاست کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے' اور نہ پارلیمان کے فیصلوں کو قرآن وسنت کا پابند کیا جاسکتا ہے' تو ''اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' کا قرآنی اصول اس کے لیے کس بنیاد پر لازم ہوگیا؟ اور یہ بات کس بنیاد پر کہی جارہی ہے کہ ''اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے'' جبکہ ریاست کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر پارلیمان مغربی ممالک کی طرح ہم جنس شادیوں کا قانون نافذ کر دے' تو کیا قرآن کریم کا باہمی مشاورت کا یہ اصول پھر بھی ''ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں؟'' اگر نہیں تو کیوں؟ جبکہ پارلیمان پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی نہ کرے؟

پھر انہوں نے آگے اپنے نکتہ نمبر ۹ میں فرمایا کہ:

''دین کے ایجابی احکام میں سے یہ صرف نماز اور زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی اگر چاہے تو قانون کی طاقت سے کرسکتا ہے۔''

''نظم اجتماعی'' سے ان کی مراد غالباً حکومت ہی ہے' تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نماز کو بزورِ قانون لازمی قرار دے کر بے نمازیوں پر سزا جاری کرے؟ اگر یہ واقعی کوئی قرآن کریم کا حکم ہے کہ نماز کا مطالبہ قانون کی طاقت سے کیا جائے' جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے' تو پھر ''اگر چاہے'' کی جو شرط انہوں نے لگائی ہے' اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اس قرآنی حکم پر عمل حکومت کی چاہت پر موقوف ہے' لہٰذا اگر وہ نہ چاہے تو اس حکم پر عمل نہ کرے۔ اس صورت میں سورۃ الاحزاب کی اس آیت (نمبر ۳۶) کا کیا مطلب ہوگا جس میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ﴾

''اور جب اللہ اور اُس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مؤمن مرد یا عورت کے لیے یہ گنجائش نہیں ہے کہ انہیں اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔''

آگے معاشرتی احکام کے حوالے سے اپنے نکتہ نمبر ا میں وہ فرماتے ہیں:

''حکومت ان کی (عوام کی) رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس ان پر عائد نہیں کر سکے گی۔ ان کے شخصی معاملات' یعنی نکاح' طلاق' تقسیم وراثت' لین دین اور اس نوعیت کے دوسرے امور اگر ان میں کوئی نزاع ہو تو اس کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا۔''

یہاں پھر کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب ریاست کا کوئی مذہب نہیں اور اس پر قرآن وسنت یا شریعت کے مطابق قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں' تو عدلیہ پر ان احکام میں شریعت ہی کے مطابق فیصلے کرنے کی پابندی کس بنیاد پر ہوگی؟ اور اگر ان معاملات میں پالیمان شریعت کے بجائے کسی اور قانون کی پابندی کا حکم دے تو اس کے سامنے نکتہ نمبر ۸ کے تحت سرِ تسلیم کیوں خم نہ کیا جائے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''ان کی رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس عائد نہیں کرے گی'' ظاہر ہے کہ اس میں عوام کی رضامندی سے مراد پارلیمان کی مرضی ہے' لہٰذا مذکورہ جملے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کوئی اور ٹیکس عائد کرنے کے لیے تو پارلیمان کی منظوری درکار ہے' لیکن زکوٰۃ حکومتی سطح پر عائد کرنے کے لیے پارلیمان کی منظوری کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہی مقصود ہے' تو حکومت پارلیمان کے کسی قانون کے بغیر زکوٰۃ کس بنیاد پر وصول کرے گی اور اس کی اس اتھارٹی کا سرچشمہ کیا ہوگا؟ اگر وہ سرچشمہ قرآن کریم ہے تو کہنا ہوگا کہ قرآن کریم پارلیمان پر بالادستی رکھتا ہے۔ پھر ریاست کا کوئی مذہب نہ ہونے کا اصول کہاں گیا؟ آگے انہوں نے فرمایا ہے:

''ریاست کا کوئی مسلمان شہری اگر زنا' چوری' قتل' فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی' خاندانی' اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں' تو اس پر وہ سزائیں نافذ کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔''

یہاں دو سوال پھر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ایسی صورت میں پارلیمان اور حکومت پر لازم ہے کہ وہ ایسے مسلمانوں پر یہ قرآنی سزائیں جاری کرے؟ اگر قرآن کریم کے حکم کے تحت لازم ہے تو جب پارلیمان پر قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں ہے' تو اس پر یہ پابندی کیسے لازم ہوگی کہ وہ قرآنی سزائیں ہی جاری کرے اور ان معاملات میں اپنی طرف سے کوئی اور سزا تجویز نہ کرے' یا ان میں سے کسی جرم (مثلاً زنا بالرضا) کو جائز قرار نہ دے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ سزائیں قرآن کریم ہی کی بنیاد پر دی جائے گی تو کیا قرآن کریم میں کوئی ایسی تفریق ہے کہ یہ سزائیں صرف ان مسلمانوں کے لیے ہیں جو شعور کے ساتھ اسلام کی دعوت کو قبول کریں' اور غیر مسلم چوروں' قاتلوں اور فساد فی الارض پھیلانے والوں کو ان سے مستثنیٰ رکھا جائے؟ جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ سزائیں صرف مسلمانوں ہی کے لیے ہوں گی۔ انہوں نے اپنے اس ''بیانیے'' میں یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں کسی جگہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں' یا انہیں ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔''

یہ وہی دوقومی نظریہ کا مسئلہ ہے جس کی بنیاد پر قائداعظم نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ یہاں مؤدبانہ گزارش یہ ہے کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں پر لغت یا عرف عام کے مطابق لفظ ''قوم'' کا اطلاق درست ہے یا نہیں' مسئلہ یہ ہے کہ مستقل سیاسی اور اجتماعی وحدت کے لحاظ سے تمام مسلمانوں کو (چاہے وہ کسی رنگ ونسل سے تعلق رکھتے ہوں) غیر مسلموں سے الگ سمجھنا اور اس بنیاد پر ان کے لیے الگ خطہ زمین کا مطالبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ قائداعظم نے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہوئے جو دوقومی نظریہ پیش کیا تھا اور جس کی بنیاد پر آج ہم ایک الگ ملک کی حیثیت سے بیٹھے ہیں' اس کا مطلب یہی تھا۔ اس دوقومی نظریہ پر بھی یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ''قوم'' کا لفظ استعمال کرنا لغت اور عرف عام کے اعتبار سے درست نہیں ہے' لیکن ان کا مقصد ''مستقل سیاسی وحدت'' تھا جس کی بنیاد پر اپنے اختیار سے کوئی حکومت قائم کی جائے۔ لغوی اعتبار سے تو تمام انبیاء علیہم السلام کی مخاطب ان کی قومیں ہی تھیں' لیکن انہوں نے ان کی بنیاد پر کوئی مستقل سیاسی وحدت قائم نہیں کی' اور اگر کوئی ریاست قائم ہوئی تو وہ وطن اور رنگ ونسل کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلام کی بنیاد پر ہوئی' جیسے حضرت موسیٰ' حضرت داؤد وسلیمان علیہم السلام کی حکومتیں اور خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی حکومت' البتہ اس میں غیر مسلموں کو تمام شہری اور مذہبی حقوق برابر حاصل تھے۔

انہوں نے ایک اور بات اپنے نکتہ نمبر۲ میں یہ ارشاد فرمائی ہے کہ ’’نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے‘ اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے‘‘۔ قرآن کریم نے سورۃ البقرۃ آیت نمبر۳۰ میں حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرے میں ارشاد فرمایا ہے کہ ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾ ’’میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں‘‘۔ اور سورۂ ص آیت نمبر۲۶ میں حضرت داؤد علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ﴿اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ ’’ہم نے تمہیں زمین خلیفہ بنایا ہے‘‘۔ نیز سورۃ النور آیت نمبر۵۵ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا ؕ﴾

’’تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں‘ ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں خلافت عطا فرمائے گا‘ جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا فرمائی تھی‘ اور ان کے لیے اس دین کو ضرور اقتدار بخشے گا جسے ان کے لیے پسند کیا ہے‘ اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے اس کے بدلے انہیں ضرور امن عطا فرمائے گا۔ وہ میری عبادت کریں‘ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔‘‘

اس کے علاوہ متعدد احادیث ہیں جن میں اسلامی ریاست کے امیر کو خلیفہ کہا گیا ہے اور اس کی حکومت کو خلافت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ قرآن وحدیث کے ان ارشادات کی بنا پر اسلامی لٹریچر اس اصطلاح سے بھرا ہوا ہے۔ فلسفۂ تاریخ کے عبقری عالم ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ ’’خلافت‘‘ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’لوگوں کو شرعی طرز فکر کے مطابق چلانا‘ جس سے ان کی آخرت کی مصلحتیں بھی پوری ہوں اور وہ دنیوی مصلحتیں بھی جن کا نتیجہ آخرکار آخرت ہی کی بہتری ہوتا ہے۔‘‘

(مقدمہ ابن خلدون: باب۳ فصل ۲۵ ص ۱۸۹)

قرآن وحدیث کے ان ارشادات اور چودہ سو سال سے اس اصطلاح کے معروف و مشہور بلکہ متواتر ہونے کے باوجود یہ فرمانا کہ خلافت کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے‘ اس پر تبصرے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ ’’مذہبی بیانیہ‘‘ دہشت گردی کے موجودہ مسائل کی اصلاح کرسکتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دستورِ پاکستان کو تلپٹ کرکے ان متضاد نکات کی بنیاد پر نئے سرے سے دستور بنایا جائے تو دہشت گرد

اپنی دہشت گردی سے باز آجائیں گے یا ان کا خود بخود قلع قمع ہو جائے گا۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ الحمدللہ ہمارے موجودہ دستور میں چند جزوی باتوں کے سوا کوئی خرابی نہیں ہے‘ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے جوہری احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے دستور میں جو بنیادی حقوق دیے گئے ہیں وہ لوگوں کو پوری طرح حاصل نہیں ہیں‘ پالیسی کے جو اصول بنائے گئے ہیں ان پر ایک دن عمل نہیں ہوا‘ صوبوں کو جو حقوق ملنے چاہئیں‘ وہ نہیں مل رہے۔ عوام کو قدم قدم پر مشکلات‘ رشوت ستانی اور ظلم وستم کے سامنا ہے۔ معیشت کے میدان میں اونچ نیچ حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ سرکاری دفتروں سے کام کرانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ عدل وانصاف کے دروازے غریبوں کے لیے تقریباً بند ہیں۔ دستور میں یہ لکھا ضرور ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور اس کے لیے دستور نے ایک میکنزم بھی تجویز کر دیا ہے‘ جس پر اگر ٹھیک ٹھیک عمل ہو تو وہ فرقہ واریت کا بھی سدباب کرسکتا ہے‘ لیکن اسے برسرکار لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہو رہی۔

یہ مجموعی صورتحال عوام میں مایوسی اور چڑچڑاہٹ پیدا کرتی ہے اور شرپسند لوگوں کو یہ پروپیگنڈا کرنے کا موقع ملتا ہے کہ یہ اصلاحات پُرامن ذرائع سے نہیں ہوسکتیں۔ اور حکومتوں کے اس طرزِ عمل نے اس بات کو مزید ہوا دی ہے کہ جو مطالبہ شریفانہ طور سے وعظ ونصیحت اور مشورے کے طور پر کیا جائے حکومت اسے درخورِ اعتناء ہی نہیں سمجھتی‘ اور لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کوئی مطالبہ اسی وقت قابلِ سماعت ہوسکتا ہے جب وہ ہڑتال اور جلاؤ گھیراؤ کے ساتھ کیا جائے اور اسی کا آخر حل یہ ہے کہ حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے جائیں۔ ملک کے دشمن مسلسل اس فکر کو ہوا دے رہے ہیں‘ اور اسی بنیاد پر جذباتی نوجوانوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا مسئلہ دستور میں کسی جوہری تبدیلی کا نہیں‘ مسئلہ اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کا ہے۔ اگر اس پر سنجیدگی سے عمل ہونے لگے‘ عوام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق انصاف میسر ہو اور اسلام کے عادلانہ قوانین ان کی روح کے ساتھ نافذ کیے جائیں‘ مجرموں کو انصاف کے تمام تقاضوں کے ساتھ عبرت ناک سزائیں دی جائیں تو یہ مسلح تحریکیں اپنی موت آپ مر جائیں گی۔ خدا کے لیے نیا انتشار پھیلانے کے بجائے متحد ہو کر اس جہت میں کام کریں۔

(روزنامہ جنگ‘ منگل ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء)

❁❁❁

اسلام اور ریاست

ابتسام الٰہی ظہیر

روزنامہ جنگ پاکستان کا ایک اہم قومی اخبار ہے۔ اس اخبار میں آج کل ریاست اور مذہب کے تعلق کے حوالے سے ایک اہم بحث کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس عنوان کی اہمیت کے پیش نظر میرا ارادہ تھا کہ میں بھی اس موضوع پر اپنی گزارشات کو نذرِ قارئین کروں۔ ۲۲ جنوری کو اسی عنوان پر آراء پڑھنے کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ قرآن وسنت کی روشنی میں فی الفور میں اپنی معروضات کو قارئین کے سامنے رکھوں اور فیصلہ قارئین خود کر لیں گے کہ حقیقت کیا ہے۔ صاحبِ مضمون نے اپنے مضمون میں مذہب اور ریاست کے باہمی تعلق کی نفی کی ہے اور اسلامی احکامات اور شریعت کو افراد کے عمل کی اصلاح تک محدود رکھا ہے۔ آپ نے اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے ایک قوم یا بالفاظِ دیگر ایک امت ہونے کو بھی سیاسی اسلام کے ترجمان مفکرین کی فکر کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔

آپ نے اپنے مضمون میں خلافت یا مسلمانوں کی عالمی ریاست کے تصور کو بھی قبول نہیں کیا اور اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ کوئی بھی گروہ اگر اسلام کا دعویدار ہو تو اس کے عقائد خواہ کسی بھی قسم کے ہوں اس گروہ یا جماعت کو مسلمان ہی تصور کرنا چاہیے۔ علماء ان کی غلطی کی نشاندہی کر سکتے ہیں لیکن ان کو کسی بھی طور پر کافر یا مرتد قرار نہیں دے سکتے۔ آپ نے اسلامی سزاؤں کے حوالے سے اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ سزائے موت کا اطلاق صرف قتل یا فساد فی الارض کے جرائم پر ہوگا اور باقی جرائم پر یہ سزائیں نہیں دی جاسکتیں۔ ان صاحب کے نزدیک نفاذِ شریعت کا مطالبہ مغالطہ انگیز ہے اور کوئی بھی قانون پارلیمان کی توثیق کے بغیر ریاستی قانون کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا' چاہے اس کے پیچھے کتنی بھی بڑی دلیل اور علماء کی جماعت کا مطالبہ بھی موجود کیوں نہ ہو۔ آپ کے نزدیک پارلیمان اور عوام کی اکثریت ہی کسی قانون کا جواز بن سکتی ہے۔ آپ نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ حکومت کسی بھی معاملے پر سختی سے عملدرآمد نہیں کروا سکتی۔ اس کے ساتھ

ساتھ آپ نے جہاد کو صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ مخصوص کر کے بعد میں اس کا اطلاق صرف ظلم کے خاتمے پر کیا ہے۔ آپ نے اپنے مضمون میں اور بھی کئی نکات پر بحث کی ہے لیکن مجموعی طور پر میں نے اہم نکات کا ذکر کر دیا ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں میری یہ کوشش ہوگی کہ قرآن وسنت کی روشنی میں ان کے دلائل کا تجزیہ کیا جائے تاکہ حقیقتِ حال کو واضح کیا جا سکے۔ جہاں تک تعلق ہے ریاست کے مذہب کا یا مذہبی احکامات افراد سے متعلق ہونے کا' تو قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے اس تاثر کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۹ میں ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ﴾ ''بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے''۔ اسی سورہ کی آیت نمبر ۸۵ میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۸۵﴾ ''جو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے گا تو اس سے وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا' اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا''۔ یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ ہر فرد کو اسلام اختیار کرنا چاہیے' چاہے وہ عام فرد ہو یا کوئی حاکم۔ اسی طرح سورۃ النساء کی آیت نمبر ۵۹ میں ارشاد ہوا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی' اطاعت کرو اُس کے رسول (ﷺ) کی اور ان حکام کی جو تم میں سے ہوں''۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ حاکم یا اولو الامر مسلمانوں کی جماعت میں سے ہوگا تو ظاہری بات ہے مسلمان ہوگا۔

ان آیات کے جواب میں اگر کوئی سوال اٹھاتا ہے کہ ان آیات میں ریاست یا حکومت کے مذہب کا ذکر نہیں بلکہ افراد یا اولوالامر کے مذہب کا ذکر ہے اور ریاست اپنی ساخت کے اعتبار سے مذہبی معاملات سے لاتعلق ہی رہے گی' تو ان کو مزید وضاحت کے لیے سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۴۴' ۴۵ اور ۴۷ پر غور کرنا چاہیے جن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات یعنی اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور بالخصوص قرآن کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو وہ منکرین' ظالموں اور فاسقوں میں شامل ہے۔ یہ آیات مسلمان حکمرانوں کو اس امر کا پابند بناتی ہیں کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کریں اور احکاماتِ الٰہی سے انحراف کر کے اپنا شمار منکرین' ظالموں اور گناہگاروں میں نہ کروائیں۔

صاحبِ مضمون نے مسلمانوں کے ایک قوم یا بالفاظِ دیگر ایک امت ہونے کی بھی نفی کی

ہے اور ان کو مختلف قومیتوں میں تقسیم کرنے کو درست اور جائز قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ الحجرات میں مسلمانوں کو شناخت کے لیے گروہوں اور قبائل میں تقسیم ہونے کو جائز قرار دیا گیا ہے لیکن اس تقسیم کی حیثیت شناخت سے کچھ زیادہ نہیں۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک امت اور ملت کی حیثیت سے ہی پکارا ہے۔ کہیں تو قرآن میں ان کو اُمتِ وَسط قرار دیا گیا' کہیں خیرالامم قرار دیا گیا' کہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت قرار دیا گیا اور سورۃ الانبیاء کی آیت نمبر ۹۲ میں وضاحت سے ارشاد فرمادیا کہ ﴿اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾﴾ ''یقیناً یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں' پھر تم میری ہی عبادت کرو''۔ انہوں نے اس سلسلے میں قرآن وسنت کے واضح دلائل کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان کے قائدین کے دوقومی نظریے کو بھی قبول نہیں کیا۔ کاش وہ مصور پاکستان کے ان اشعار پر ہی غور فرمالیتے:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

جہاں تک تعلق ہے خلافت کا تو ''استخلاف فی الارض'' کا ذکر کتب احادیث سے کہیں پہلے ہی قرآن مجید میں موجود ہے۔ سورۃ النور کی آیت نمبر ۵۵ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلافت دے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور ان کے لیے دین کو قائم کردے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے اور ان کے خوف کو امن میں ضرور بدلے گا''۔ کتبِ احادیث کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد تیس سالہ دور کو خلافتِ راشدہ کا دور قرار دیا ہے۔ اسی طرح جہاں پر نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد کسی نبی کی آمد کی نفی فرمائی وہیں پر آپ ﷺ نے اس بات کا بھی ذکر فرمایا کہ آپؐ کے بعد خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے۔ نبی کریم ﷺ کے بعد مسلمانوں کے خلفاء پوری اسلامی سلطنت کے بیک وقت امیر رہے اور جغرافیائی وسعت کے باوجود مسلمانوں کا دارالخلافہ تمام علاقوں کے امور کا نگران رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ سے

متعلق روایات مسلمانوں کی عالمگیر سلطنت کے دوبارہ قیام کا اشارہ کرتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمدِ ثانی کے حوالے سے ارشاد فرمایا کہ وہ عادل حکمران ہوں گے۔ اسی طرح حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بھی ارشاد ہوا کہ وہ زمین سے ظلم اور جور کا خاتمہ کر کے اس کو عدل سے بھر دیں گے۔ زمین پر جاری ظلم کے خاتمے اور اس کو عدل سے بھر دینے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کو دوبارہ عالمگیر سیاسی عروج حاصل ہوگا۔

جہاں تک تعلق ہے کہ علمائے امت کسی گروہ کو' خواہ اس کے عقائد کسی بھی قسم کے ہوں غیر مسلم قرار نہیں دے سکتے' یہ نظریہ بھی ہر اعتبار سے مذموم ہے۔ اس استدلال کو درست مان لیا جائے تو عقیدۂ ختم نبوت کا انکار کرنے والے تمام گروہ اسلام کے دامن میں پناہ لینے کے قابل ہو جائیں گے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمانِ مبارک واضح ہے کہ میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔ یہ فرمانِ مبارک اجماعِ امت کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور مسلمان بحیثیت مجموعی جب بھی کوئی فیصلہ کریں تو مؤمنوں کے راستے' فیصلے اور طریقے کی مخالفت بجائے خود ایک بہت بڑی گمراہی ہے۔ تمام مکاتب فکر کے جید اور نمائندہ علماء نے ختم نبوت کا انکار کرنے کی وجہ سے مرزائیوں (قادیانیوں) کو کافر قرار دیا ہے۔ اب مسلمانوں کے اس اجتماعی فیصلے سے انحراف کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۱۵ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾﴾

''اور جو کوئی رسول اللہ (ﷺ) کی مخالفت کرے گا اس کے بعد کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی اور اہلِ ایمان کے اور مؤمنوں کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ اختیار کرے گا تو ہم اس کو اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا' پھر اسے جہنم میں داخل کر دیں گے' اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔''

اہلِ ایمان کے راستے سے انحراف کے ساتھ ساتھ ان کے سامنے اس بات کو بھی رکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر وہ آئین' قانون اور پارلیمان ہی کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں تو کم از کم ختمِ نبوت کے منکرین کے بارے میں پارلیمان اور آئین کے فیصلے کو قبول فرمائیں کہ یہ گروہ اور جماعتیں صرف علماء کے اتفاق کی وجہ سے دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوئیں' بلکہ پارلیمان' آئین اور قانون میں بھی ان گروہوں اور جماعتوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے۔

جہاں تک تعلق ہے اسلامی سزاؤں کا کہ صرف قتل اور فساد فی الارض کے باب میں سزائے موت درست ہے تو یہ بات بھی صحیح نہیں۔ شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لیے حدِ رجم ہونے کا ذکر وضاحت سے کتب احادیث میں موجود ہے۔ شبیبہ غامدیہ کا رجم فساد فی الارض کی تعزیر کے طور پر نہیں ہوا تھا بلکہ زنا کی حد کے طور پر ہوا تھا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ شبیبہ غامدیہ کو زنا کے ارتکاب پر پکڑا نہیں گیا تھا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ کو اس سزا کے لیے پیش کیا تھا۔ اسی طرح توہینِ رسالت ﷺ کے حوالے سے بھی کتبِ احادیث وسیرت میں متعدد واقعات مذکور ہیں کہ جن لوگوں نے توہینِ رسالت کا ارتکاب کیا تھا ان کو زمانۂ رسالت ہی میں سزائے موت دی گئی تھی۔ اور اگر آئین اور قانون ہی کا حوالہ ان صاحب کو مطمئن کر سکتا ہے تو آپ کو 295a,b اور c پر غور کر لینا چاہیے کہ توہینِ رسالت کی سزا' سزائے موت کو تو ہمارا آئین اور قانون بھی درست تسلیم کرتا ہے۔

نفاذِ شریعت کا مطالبہ کسی بھی اعتبار سے مغالطہ انگیز نہیں' بلکہ یہ تو وہ اہم ذمہ داری ہے جو حکمرانوں کو اللہ تعالیٰ نے خود تفویض کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۴۱ میں ارشاد فرماتے ہیں: ''یہ لوگ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔'' یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حکمران اقامتِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ تمام معروف کاموں کا حکم دیں گے اور تمام منکرات سے روکیں گے۔ اس لیے ایسے معاملات کی تنفیذ کے مطالبے کو مغالطہ سمجھنا جن کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے' بجائے خود ایک مغالطہ ہے۔ اس آیت میں اس نکتے کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ حکمرانوں کی ذمہ داریاں صرف نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ زکوٰۃ تک محدود نہیں بلکہ تمام معروف کاموں کا اجراء اور تمام منکرات کاموں کی روک تھام بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ حدود اللہ کے نفاذ کے ساتھ ساتھ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مسلمان حکمران وقت کی مصلحت کے اعتبار سے تعزیرات کا استعمال کرنے کے بھی مجاز ہیں۔

صاحبِ مضمون نے قوانین کا بڑا ماخذ قرآن وسنت کے بالمقابل پارلیمان کو قرار دیا ہے۔ گویا کہ پارلیمان قرآن وسنت کے تابع نہیں بلکہ قرآن وسنت پارلیمان کے تابع ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ کہ افراد اور ارکانِ پارلیمان کو قانون سازی کا لامحدود اختیار حاصل ہوگا اور مخلوق کے اختیارات اس مسئلے میں خالق کے اختیارات پر بھی سبقت لے جائیں گے۔ یہ

تصور آج سے پہلے کسی بھی مسلمان دانشور نے پیش نہیں کیا۔ مغربی جمہوریت اور پارلیمان کو قانون سازی کے لامتناہی اختیارات حاصل ہیں' لیکن جہاں تک مسلمانوں کی پارلیمان اور شوریٰ کا تعلق ہے تو وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات کی پابند ہے' اور یہی وہ اصول ہے جسے قراردادِ مقاصد اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں طے کر لیا گیا تھا۔ مشاورت کی آڑ میں الحادی جمہوریت کی ترجمانی نہ صرف یہ کہ قرآن وسنت کی واضح تعلیمات سے متصادم ہے بلکہ اس استدلال کے ذریعے اسلامی جمہوریت' نظریۂ پاکستان اور آئینِ پاکستان سے بھی انحراف کیا گیا ہے' اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان صاحب نے قرآن وسنت کی بالادستی کو عالمی سطح پر سیاسی فرقہ واریت کی بنیاد قرار دیا ہے۔

جہاں تک جہاد کا تعلق صرف رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے ساتھ تھا' تو یہ استدلال بھی خود ساختہ ہے۔ قرآن مجید میں جہاد سے متعلق بیسیوں آیات ہیں اور خلفائے راشدین' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین ہر دور میں جہاد کرتے رہے۔ یہ بات درست ہے کہ جہاد نظمِ اجتماعی یا حکومت کے ذریعے ہی ہونا چاہیے' لیکن یہ شرط جہاد کے معطل یا موقوف ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔ حدیثِ پاک میں وضاحت ہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بھی اہلِ ایمان کی ایک جماعت دجال سے قتال کرے گی۔

قرآن وسنت کی نصوص' کتبِ سیرت اور تاریخ میں وہ پیغام جو مذہب اور ریاست کے حوالے سے موجود تھا' میں نے اس کو خلوصِ نیت سے قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن وسنت اور احکامات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

(روزنامہ جنگ' پیر ۲۶ جنوری ۲۰۱۵ء)

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اسلام اور ریاست

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر☆

(جوابِ غزل در: ''اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ'')

روزنامہ جنگ ۲۲ جنوری ۲۰۱۵ء کے ادارتی صفحات پر ملک کے معروف اور نامور اسکالر جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ایک کالم ''اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کالم کے جواب میں اصحابِ علم و فضل کی بہت سی تحریریں روزنامہ جنگ اور دیگر اخبارات کے صفحات پر شائع ہوئیں۔ ہماری اس تحریر میں یہ کوشش ہوگی کہ ہم جناب غامدی صاحب کے مجموعی فکر کے تناظر میں ان کے کالم کا ایک تجزیہ پیش کریں۔ جو باتیں درست ہیں' ان سے اتفاق بیان کریں..... اور جو غلط ہیں' ان کے بارے میں صحیح موقف پیش کریں۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس وقت جو صورت حال بعض انتہا پسند تنظیموں نے اپنے اقدامات سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے پوری دنیا میں پیدا کر دی ہے' یہ اسی فکر کا نتیجہ ہے جو ہمارے مذہبی مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے' اور جس کی تبلیغ اسلامی تحریکیں اور مذہبی سیاسی جماعتیں شب و روز کرتی ہیں۔''

ہمیں اور نہ ہی اہلِ مدرسہ کو انتہا پسند تنظیموں کے افکار و اعمال سے اتفاق ہے' جبکہ غامدی صاحب کا یہ بیان مدارسِ دینیہ' اسلامی تحریکوں اور مذہبی سیاسی جماعتوں پر ایک الزام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خود غامدی صاحب' جو مدرسہ کے نظام و نصاب سے نہیں گزرے' وہ یہ کیسے طے کر سکتے ہیں کہ مدارسِ اسلامیہ میں وہ سب کچھ پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے جو تحریکِ طالبان پاکستان یا القاعدہ کے افکار و نظریات ہیں۔ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ اسی طرح کا دعویٰ ہے جو مدرسے کا ایک فارغ التحصیل پاکستانی یونیورسٹیوں کے بارے میں یہ کہہ کر کرے کہ یہاں تو

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، کامسائٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور
ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk فیس بک: Hm Zubair

الحاد پڑھایا جاتا ہے۔ اگر مدارسِ دینیہ اور اسلامی تحریکوں میں یہ سب کچھ پڑھایا جاتا ہوتا تو یہ عملی انتہا پسندی آپ کو ایوب' بھٹو اور ضیاء الحق کے ادوار میں بھی نظر آتی۔ پاکستان میں انتہا پسند عناصر ان تحریکوں کی کوکھ سے برآمد ہوئے جنہیں امریکہ نے پاکستانی آمروں کے تعاون سے روس کے خلاف کھڑا کیا۔ پس عملی انتہا پسندی کے مسئلے کا حل دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی یا اسلامی تحریکوں کے افکار پر پابندی سے کسی صورت حاصل نہ ہوگا' کیونکہ یہ اس کی اصل وجہ ہے ہی نہیں۔ اگر ہم ملک پاکستان کو انتہا پسند عناصر کے چنگل سے نکالنے میں سنجیدہ ہیں تو ہمیں وہ وجوہات ختم کرنی ہوں گی جو امر واقعی میں انتہا پسندوں کے کارخانے قائم کیے چلی جا رہی ہیں۔ اور انتہا پسند عناصر کے کارخانے لگنے کی وجوہات میں سب سے اہم وجہ ۱۹۸۰ء سے جنوبی ایشیا میں امریکی پالیسی اور فورسز کی اپنے مفادات کے تحفظ اور فروغ کے لیے موجودگی اور ہمارا بحیثیت قوم انہیں خوش آمدید کہنا اور ان کے ہاتھوں کبھی جہاد اور کبھی امن کے نام پر استعمال ہونا ہے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس کے بالمقابل اسلام کا صحیح فکر کیا ہے؟ یہ درحقیقت ایک جوابی بیانیہ ہے اور ہم نے بارہا کہا ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں مذہب کی بنیاد پر فساد پیدا کر دیا جائے تو سیکولرازم کی تبلیغ نہیں' بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانہ ہی صورت حال کی اصلاح کر سکتا ہے۔''

ہمیں غامدی صاحب کی اس بات سے اتفاق ہے کہ جب معاشرے میں اسلام کے نام پر فساد پیدا کر دیا جائے تو اس کا جواب ''سیکولرازم کی تبلیغ'' نہیں ہے بلکہ فساد برپا کرنے والی مذہبی فکر کا جوابی بیانیہ تیار کرنا ہے۔ پس کسی معاشرے کے لیے یہ صحت مند رویہ نہیں ہے کہ انتہا پسندوں کے فکر یا ان کی کارروائیوں کے ردِّعمل میں دین اسلام ہی سے اس لیے بیزار ہو جائے کہ وہ اس قسم کی فکر یا کارروائیوں کے لیے اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں' بلکہ صحیح رویہ ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ یہ اسلامی فکر اور دینی عمل نہیں ہے۔ یہ ایک معتدل اور عمدہ بات ہے۔ جزاکم اللہ خیراً!..... لیکن دیگر اصحابِ علم و فضل کا کہنا یہ ہے اس پر تو بحث ہو سکتی ہے نا کہ جناب غامدی صاحب نے جو ''جوابی بیانہ'' تیار کیا ہے' اسے بھی ''سیکولرازم کی تبلیغ'' میں ہی رکھا جائے یا وہ امر واقعی میں اس سے ہٹ کر ایک ''جوابی بیانیہ'' ہے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''لہٰذا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اس کو بھی کسی

قراردادِ مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔''

غامدی صاحب کی یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ بات ریاست کی تعریف ہی کے خلاف ہے۔ ریاست کے ارکان (pillars) میں علاقہ (territory)' آبادی (population)' حکومت (government) کے علاوہ اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) بھی شامل ہے' جبکہ حکومت کے ارکان میں پارلیمنٹ' عدلیہ اور انتظامیہ شامل ہے' اور اب بعض ماہرین سیاسیات میڈیا کو بھی اس کا ایک رکن قرار دیتے ہیں۔ پس علم سیاسیات (political science) میں ریاست کا کوئی ایسا تصور موجود نہیں ہے کہ جس میں اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کو اس سے علیحدہ کیا جا سکے۔ مانا کہ ریاست اور حکومت میں فرق ہے' جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا' لیکن اقتدار اعلیٰ (sovereignty) کو طے کیے بغیر کوئی ریاست' ریاست کہلانے کی مستحق بھی نہیں ہے۔ اور مسلمانوں کی ایک ریاست میں یہ مقتدرِ اعلیٰ (sovereign) اور مختارِ اعلیٰ (supreme authority) کتاب وسنت کے علاوہ کسے بنایا جا سکتا ہے؟

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے' وہ اپنی ایک ریاست ہائے متحدہ قائم کر لیں۔ یہ ہم میں سے ہر شخص کا خواب ہو سکتا ہے اور ہم اس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی جدوجہد بھی کر سکتے ہیں' لیکن اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم ہے جس کی خلاف ورزی سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔''

غامدی صاحب کی یہ بات درست نہیں ہے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے: ((إِذَا بُوِيعَ لِخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الآخَرَ مِنْهُمَا)) کہ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کر دو۔ ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا دوسرے خلیفہ کو قتل کرنے کا حکم اس صورت میں ہے جبکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کا خلیفہ ایک ہی ہو' جیسا کہ شروع اسلام میں مسلمانوں کی ایک ہی اجتماعیت تھی۔ اب جبکہ مسلمانوں چھوٹی چھوٹی پچاس سے زائد ریاستوں میں تقسیم ہو چکے تو اس حدیث کے مقصد پر عمل کی طرف امت کو راغب کیا جائے گا اور وہ مقصد ہے مسلمانوں کی عالمی اجتماعیت کا قیام۔ پس موجودہ اسلامی ریاستوں کو ایک ''اسلامی ریاست ہائے متحدہ'' کے قیام کی طرف پیش رفت کرنی چاہیے' یہ ایک دینی حکم ہے۔ اگر یہ دینی حکم نہ ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ مسلمانوں کی اجتماعیت کو تقسیم کرنے پر قتل کا حکم جاری کیوں

فرماتے؟ اسی طرح اگر ''ریاست ہائے متحدہ امریکہ'' کا وجود میں آنا ان ریاستوں کے لیے سیاسی' معاشی اور معاشرتی اعتبار سے مفید ہو سکتا ہے تو ''اسلامی ریاست ہائے متحدہ'' کے مسلم امت کے لیے ان کے اجتماعی پہلوؤں سے مفید ہونے میں کیا بحث ہو سکتی ہے؟ اور کیا ہمارا دین جو ایک فرد کے ذاتی اور جزوی فائدے کا بھی لحاظ کرتے ہوئے احکام جاری کرتا ہے' اس دین میں اس چیز کا حکم ہی نہ ہو گا کہ جس میں پوری امت کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی مفادات موجود ہوں؟ اگر ایسا ہے تو یہ تعبیر بہت ہی قابل تعجب ہے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''پہلی صدی ہجری کے بعد ہی' جب مسلمانوں کے جلیل القدر فقہاء ان کے درمیان موجود تھے' ان کی دو سلطنتیں' دولت عباسیہ بغداد اور دولت امویہ اندلس کے نام پر قائم ہو چکی تھیں اور کئی صدیوں تک قائم رہیں' مگر ان میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا۔''

اس بارے میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایک ہے امر واقعی اور ایک امر شرعی۔ امرِ شرعی تو یہی ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کے رسول ﷺ نے اس حال میں چھوڑا کہ انہیں اپنے بعد ایک ہی خلیفہ مقرر کرنے اور صرف اسی کی بیعت کرنے کا حکم جاری کیا' جیسا کہ اوپر روایت گزر چکی۔ امر واقعی یہ ہے کہ مسلمان امت تفرقے میں پڑ کر تقسیم ہو گئی۔ عراق میں بنو عباس' مصر میں فاطمی اور اندلس میں اموی حکومت قائم ہوئی۔ فقہاء نے اس تقسیم کے قائم ہو جانے کے بعد امت کے لیے اپنے علاقوں کے مسلمان حکمرانوں کی اطاعت کو ترجیح دی' لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑی ہی تھا کہ وہ امت کے بٹ جانے کو شرعی بھی سمجھتے تھے۔ فقہاء کیسے اس تقسیم پر راضی ہو سکتے تھے جبکہ وہ جانتے تھے کہ یہ مسلمانوں میں باہمی جنگ وجدال اور قتل وغارت گری کی بنیاد ہے۔ اور بنو عباس اور بنو امیہ' عباسی اور فاطمی دشمنی اور قتل وغارت گری کی داستانیں کس پر واضح نہیں ہیں؟ اور مسلمانوں کی اسی باہمی قتل وغارت گری کے نتیجے میں ہی تو بنو امیہ کی حکومت قائم ہوئی ہے اور دیگر حکومتیں بھی اسی طرح سے قائم ہوئی ہیں۔ کیا یہ کہنا کوئی مناسب بات ہو گی کہ اسلام باہمی قتل وغارت گری کے ذریعے مسلم امت کی تقسیم کو جائز قرار دیتا ہے؟ اگر نہیں' تو پھر غامدی صاحب کو تاریخ کے صفحات سے یہ واضح کرنا چاہیے تھا کہ بنو عباس اور بنو امیہ اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کی یہ تقسیم کسی باہمی صلح وصفائی کا نتیجہ تھی۔ اندلسی فقیہ اور مجتہد امام ابن حزم رحمہ اللہ اپنی کتاب ''مراتب الاجماع'' میں لکھتے ہیں:

وَاتَّفَقُوا أنه لَا يجوز أَن يكون على الْمُسلمين فِي وَقت وَاحِد فِي جَمِيع

الدُّنیا امامان لَا متفقان وَلَا مفترقان وَلَا فِی مکانین وَلَا فِی مَکَان وَاحِد ۔

''اہلِ علم کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ یہ بالکل بھی جائز نہیں کہ مسلمانوں کے ایک ہی وقت میں پوری دنیا میں دو خلیفہ ہوں' چاہے وہ آپس میں متفق ہوں' چاہے اختلاف کرنے والے ہوں' چاہے دو مختلف علاقوں میں ہوں' چاہے ایک ہی علاقہ میں ہوں۔''

اسی طرح امام بیہقی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''السنن الکبریٰ'' میں باقاعدہ **"باب لا یصلح إمامان فی عصر واحد"** (ایک ہی وقت میں دو مسلمان خلفاء کا ہونا جائز نہیں ہے) کے نام سے باب باندھ کر اس کے ذیل میں احادیث نقل کرتے ہیں۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔''

خلیفہ سے مراد وہ مسلمان حکمران ہے جو اللہ کے بندوں کے مابین اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے کرے۔ اللہ عزوجل سورۃ صٓ (آیت ۲۶) میں فرماتے ہیں:

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾

''اے داؤد (علیہ السلام)! بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے' پس آپ لوگوں کے مابین حق کے ساتھ فیصلے فرمائیں۔''

اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''مسند احمد'' میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

فَقَالَ حُذَیْفَةُ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: **((تَكُونُ النُّبُوَّةُ فِیكُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ یَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ یَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ یَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ یَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا عَاضًّا، فَیَكُونُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ یَكُونَ، ثُمَّ یَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ یَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبْرِیَّةً، فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُونَ، ثُمَّ یَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ یَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلَى مِنْهَاجِ نُبُوَّةٍ))** ثُمَّ سَكَتَ

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے درمیان نبوت اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک اللہ عزوجل چاہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے' نبوت کو اٹھالیں گے۔ پھر نبوت کے منہاج پر خلافت قائم ہوگی' پس یہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ جب تک اللہ چاہیں گے' قائم رہے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے' اس خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو اٹھالیں گے۔ پھر کاٹ کھانے والی

ملوکیت آئے گی اور یہ ملوکیت جب تک اللہ عزوجل چاہیں گے' باقی رہے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے' اس کاٹ کھانے والی ملوکیت کو بھی اٹھالیں گے۔ پھر جبری ملوکیت قائم ہوگی اور اللہ عزوجل جب تک چاہیں گے' یہ جبری ملوکیت قائم رہے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے' اس جبری ملوکیت کو اٹھالیں گے۔ اس کے بعد ایک بار پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی''۔ اس کے بعد آپ ﷺ خاموش ہوگئے۔

البتہ اس میں اختلاف ممکن ہے کہ کاٹ کھانے والی اور جبری ملوکیت کے ادوار کون سے ہیں؟ اور ان ادوار کے بعد قائم ہونے والی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور کون سا ہے؟ لیکن اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ایک ایسا عادلانہ سیاسی نظام ہے کہ جو اللہ کے رسول ﷺ اس امت کو دے کر گئے اور ظلم وجور کے نظام کے بعد ایک بار پھر اس کے آنے کی خوشخبری دے کر گئے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ بات سب نے کہی اور ہم بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا نظم اجتماعی اگر کسی جگہ قائم ہو جائے تو اس سے خروج ایک بدترین جرم ہے۔''

غامدی صاحب کی یہ بات درست ہے اور اہلِ سُنّت والجماعت کی عقیدے کی کتب میں یہی لکھا ہوا ہے اور یہی ائمہ وفقہائے دین کی رائے ہے کہ مسلمانوں کے نظم اجتماعی کے خلاف خروج جائز نہیں ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''العقیدۃ الطحاویۃ'' میں فرماتے ہیں:

ولا نرى الخروج على أئمتنا وولاة أمورنا وإن جاروا، ولا ندعوا عليهم، ولا ننزع يداً من طاعتهم، ونرى طاعتهم من طاعة الله عز وجل فريضة، ما لم يأمروا بمعصية، وندعوا لهم بالصلاح والمعافاة

''اور ہم اپنے حکمرانوں اور امراء کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے' چاہے وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں۔ اور نہ ہم ان کے خلاف بددعا کرنے کے قائل ہیں' اور نہ ہی ہم ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچتے ہیں' اور ہم ان کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کی طرح فرض سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ کسی معصیت کا حکم نہ دیں۔ اور ہم ان کے لیے اصلاح اور معافی کی دعا کرتے رہتے ہیں۔''

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے' جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن

وحدیث میں کسی جگہ یہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں یا انہیں ایک قوم ہونا چاہیے' بلکہ یہ کہا گیا کہ انما المؤمنین اخوۃ (مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں)۔قرآن کی رو سے مسلمانوں کا باہمی رشتہ قومیت کا نہیں' بلکہ اخوت کا ہے۔ وہ دسیوں اقوام' ممالک اور ریاستوں میں تقسیم ہونے کے باوجود ایمان کے رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔اس لیے یہ تقاضا تو ان سے کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کے حالات کی خبر رکھیں' ان کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں ان کے کام آئیں' وہ مظلوم ہوں تو ان کی مدد کریں' معاشی اور معاشرتی روابط کے لیے ان کو ترجیح دیں اور ان پر اپنے دروازے کسی حال میں بند نہ کریں' مگر یہ تقاضا نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی قومی ریاستوں اور قومی شناخت سے دست بردار ہو کر لازماً ایک ہی قوم اور ایک ریاست بن جائیں۔''

یہاں غامدی صاحب کی کچھ بات درست ہے کہ مسلمانوں کو قرآن وحدیث میں کہیں بھی ایک قوم نہیں کہا گیا اور مسلمان ایمان کے رشتے کی بنیاد پر ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ''قومیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بنتیں'' یہ بات درست ہے۔قرآن مجید میں ہر نبیؑ نے اپنے مخاطبین کو ''یٰقَوْمِ'' کے خطاب سے اپنی قوم قرار دیا' حالانکہ مخاطبین نبیؑ کے دین پر نہیں تھے۔ اسی طرح قرآن مجید نے مشرکینِ مکہ کو اللہ کے نبی ﷺ کی قوم قرار دیا ہے۔پس یہ بات درست ہے کہ قومیں جغرافیائی حدود کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں۔لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلام میں قومیت کی بجائے ''امت'' اور ''ملت'' کا تصور ہے۔ اسلام پوری دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم نہیں بلکہ ایک ''امت'' اور ''ملت'' قرار دیتا ہے' جیسا کہ پوری دنیا کے کافر ایک ''امّت'' یا ''ملّت'' ہیں' چاہے ان کی قومیں مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ (آیت ۱۴۳) میں ارشاد ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾

''اور ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر شہادت قائم کرو۔''

ایک اور جگہ سورۃ آل عمران (آیت ۱۱۰) میں مسلمانوں کو ''خیر امت'' کہا گیا ہے' وعلیٰ ہذا القیاس۔ اسی طرح قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الآثار'' میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں: اَلْكُفْرُ كُلُّهُمْ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ (عالمِ کفر سب کا سب ایک ہی ملت ہے)۔پس ایمان کے رشتے کی بنیاد پر مسلمانوں میں ''اخوت'' بھی قائم ہوئی اور ''امت وملّت'' بھی۔ ''اسلامی اخوت'' کی اصطلاح میں مسلمانوں کی باہمی معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے کا تصور

ہے' جبکہ ''اُمّتِ مسلمہ'' یا ''ملّتِ اسلامیہ'' کی اصطلاح میں ''سیاستِ شرعیہ'' کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یہ بھی عرض کرتے چلیں کہ غامدی صاحب نے اپنے حافظے سے سورۃ الحجرات کی جو یہ آیت (۱۳) نقل کی ہے: ''اِنما المؤمنین اِخوۃ'' تو اس کا صحیح رسم ''اِنمَا الْمُؤمنون اِخوۃ'' ہے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''دنیا میں جو لوگ مسلمان ہیں' اپنے مسلمان ہونے کا اقرار' بلکہ اس پر اصرار کرتے ہیں' مگر کوئی ایسا عقیدہ یا عمل اختیار کر لیتے ہیں جسے کوئی عالم یا علماء یا دوسرے تمام مسلمان صحیح نہیں سمجھتے' ان کے عقیدے یا عمل کو غلط قرار دیا جا سکتا ہے' اسے ضلالت اور گمراہی کہا جا سکتا ہے' لیکن اس کے حاملین چونکہ قرآن وحدیث ہی سے استدلال کر رہے ہوتے ہیں' اس لیے انہیں غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

یہ مسئلہ بہت اہم ہے کہ جس پر غامدی صاحب نے کلام کیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہاں ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کی مشق نے امت کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کے بقول چودہ صدیوں میں ہم نے اتنے مسلمان نہیں بنائے جتنے ایک صدی میں فتووں سے کافر بنا دیے ہیں۔لیکن تکفیر کے اس فتنے کا حل یہ نہیں ہے کہ یہ بیانیہ تیار کیا جائے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کسی کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا' چاہے وہ قرآن مجید سے اپنے مذہبی پیشوا کی نبوت ثابت کر لے یا چاہے الوہیت' چاہے وہ کتابِ الٰہی سے ہمہ اوست ثابت کر دکھائے' چاہے ضروریاتِ دین اور ارکانِ اسلام کا ہی انکار کر دے۔اس فتنے کا صحیح حل یہی ہے کہ عام مفتیوں اور علماء کو قانوناً اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ تکفیر کے بارے میں کوئی فتویٰ جاری نہ کر سکیں اور اسلامی نظریاتی کونسل کی طرح کا کوئی ایسا حکومتی ادارہ ہو کہ جس میں ملک بھر سے مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء کی نمائندگی ہو' اور جب تک کسی متعین شخص یا گروہ یا جماعت کی تکفیر پر ان نمائندہ علماء کا اتفاق نہ ہو' اور یہ اہلِ علم ملک کی اعلیٰ عدالت مثلاً سپریم کورٹ کے شریعہ بنچ میں مخالف فریق پر اس کی غلطی واضح نہ کر دیں اور اس بارے میں اعلیٰ عدالت کا کوئی فیصلہ جاری نہ ہو جائے' اُس وقت تک کسی کلمہ گو کی تکفیر قانوناً جرم قرار دی جائے۔البتہ کسی کے کفر کو کفر اور شرک کو شرک قرار دینا' تو اس کی اجازت ہر صاحبِ علم کے لیے ہونی چاہیے' جیسا کہ غامدی صاحب بھی اس بات سے متفق ہیں۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''علماء کا حق ہے کہ ان کی غلطی ان پر واضح کریں' انہیں صحیح بات کے قبول کرنے کی

دعوت دیں‘ ان کے عقائد ونظریات میں کوئی چیز شرک ہے تو اسے شرک اور کفر کہیں اور لوگوں کو بھی اس پر متنبہ کریں‘ مگر ان کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے یا انہیں مسلمانوں کی جماعت سے الگ کر دینا چاہیے‘ اس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے‘ اس لیے کہ یہ حق خدا ہی دے سکتا تھا اور قرآن وحدیث سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اس نے یہ حق کسی کو نہیں دیا ہے۔‘‘

یہاں اصل میں دو چیزیں خلط ملط ہو رہی ہیں۔ ایک ہے اہلِ علم کا کسی کے بارے میں فتویٰ جاری کرنا کہ وہ دین اسلام سے خارج ہو گیا ہے اور ایک ہے کسی شخص کا اللہ کے ہاں کافر قرار پانا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اہلِ علم کی ایک جماعت کسی شخص کو دنیا میں کافر قرار دے گی تو ضروری نہیں ہے کہ وہ عنداللہ بھی کافر ہو‘ کیونکہ یہ اہلِ علم کا اجتہاد ہے اور اجتہاد میں خطا کا پہلو بھی ہو سکتا ہے‘ اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اجتماعی اجتہاد میں خطا کا پہلو کم ہو جاتا ہے۔ پس اہلِ علم اگر کسی پر فتویٰ لگائیں گے تو وہ دنیا کے اعتبار سے ہوگا‘ اور دنیا میں یہ فتویٰ ’’سدالذرائع‘‘ کے اصول کے تحت لگایا جائے گا تاکہ دین کی حفاظت ہو۔ اور فتویٰ کا لفظ بھی ’’فتوۃ‘‘ سے ہے کہ جس کے معنی ’’نوجوانی‘‘ کے ہیں۔ پس جب کسی معاشرے میں عقیدے اور عمل کے رستے ایسا بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ جس سے معاشرہ روحانی اور دینی طور پر اضمحلال کا شکار ہو جائے تو اس وقت ’’فتویٰ‘‘ کے ذریعے اسے دوبارہ قوت مہیا کی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ فتویٰ کا ہمارے معاشروں میں ایسا غلط استعمال بہت زیادہ ہے کہ جسے روکنے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کسی شئے کے غلط استعمال کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ نفسِ امر میں وہ شئے غلط ہے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

شرک‘ کفر اور ارتداد یقیناً سنگین جرائم ہیں‘ لیکن ان کی سزا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو نہیں دے سکتا۔ یہ خدا کا حق ہے۔‘‘

شرک اور کفر کی حد تک تو بات درست ہے کہ اس کی سزا آخرت میں ہی ملے گی‘ جیسا کہ سورۃ البقرۃ (آیت ۲۵۶) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ ’’دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے‘‘۔ پس کسی شخص کو مسلمان بننے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ’’ارتداد‘‘ ایک علیحدہ اصطلاح ہے۔ ’’ارتداد‘‘ سے مراد کسی مسلمان کا دینِ اسلام سے پھر جانا ہے۔ دین اسلام‘ ارتداد کو اسلامی ریاست سے ایک بغاوت قرار دیتا ہے‘ لہٰذا اس کی سزا قتل تجویز کرتا

ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ’’مسند الشافعی‘‘، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ’’مسند احمد‘‘ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ’’صحیح بخاری‘‘ میں اللہ کے رسول ﷺ کا مسلمانوں کے بارے میں یہ ارشاد نقل کیا ہے: ((مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ)) ’’جو اپنا دین تبدیل کر لے تو اسے قتل کر دو‘‘۔ امام مالک رحمہ اللہ نے بھی اس مضمون کی روایت اپنی کتاب ’’الموطا‘‘ میں نقل کی ہے۔ البتہ فقہاء نے یہ نقل کیا ہے کہ جو مسلمان دینِ اسلام سے پھر جائے گا‘ پہلے اسے قید کیا جائے گا اور اس کے اعتراضات اور شکوک وشبہات کو رفع کر کے اس پر حجت قائم کی جائے گی‘ اس کے بعد اس پر یہ سزا نافذ کی جائے گی۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اسے ریاست نے امان اسی کلمے کی بنیاد پر دی تھی کہ جس کلمے کی اطاعت کو اس نے اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ اسی طرح چونکہ وہ ذمی بھی نہیں ہے کہ اسے جزیہ کی وجہ سے امان حاصل ہوئی ہے‘ لہٰذا اس کا یہ عمل جب تک اسلامی ریاست کی حدود میں ہو تو اطاعت کے قلادے کو اتار پھینکنے کی وجہ سے سراسر بغاوت پر مبنی عمل ہے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

’’اس میں شبہ نہیں کہ جہاد اسلام کا حکم ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں سے تقاضا کرتا ہے کہ ان کے پاس طاقت ہو تو وہ ظلم وعدوان کے خلاف جنگ کریں۔ قرآن میں اس کی ہدایت اصلاً فتنہ کے استحصال کے لیے کی گئی ہے۔ اس کے معنی کسی شخص کو ظلم وجبر کے ساتھ اس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں persecution کہا جاتا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ حکم ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں‘ بلکہ بحیثیت جماعت دیا گیا ہے۔‘‘

غامدی صاحب نے یہاں جہاد کا مقصد درست بیان کیا ہے کہ وہ ظلم وعدوان کا خاتمہ ہے۔ پس جہاد کا حکم لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے نہیں بلکہ ظلم وزیادتی کے خاتمے کے لیے ہے۔ لیکن ظلم سے مراد صرف وہی ظلم نہیں ہے کہ جو کسی شخص کو اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے کیا جائے‘ بلکہ ظلم میں ہر قسم کا ظلم شامل ہے۔ خلفائے راشدین کے دور میں جس قدر اقدامی جہاد ہوا ہے‘ مثلاً روم وفارس سے جو جہاد ہوا تو وہاں کون سے مسلمان موجود تھے کہ جن پر ہونے والے ظلم کے جواب میں یہ جہاد جاری کیا گیا؟ اس جہاد کا مقصد اس ظلم کا خاتمہ تھا جو اہلِ روم اور اہلِ فارس اپنی اقوام پر کر رہے تھے۔ امام ابن جریر طبریؒ نے اپنی کتاب ’’تاریخ الرسل والملوک‘‘ میں مسلمانوں کے سفیر عامر بن ربعی رضی اللہ عنہ کا ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار

میں جو مکالمہ نقل کیا ہے' اس کا ایک حصہ یہ ہے:

اَللّٰهُ ابْتَعَثَنَا، وَاللّٰهُ جَاءَ بِنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللّٰهِ، وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سِعَتِهَا، وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الإِسْلامِ، فَأَرْسَلَنَا بِدِينِهِ إِلَى خَلْقِهِ لِنَدْعُوَهُمْ إِلَيْهِ، فَمَنْ قَبِلَ مِنَّا ذٰلِكَ قَبِلْنَا ذٰلِكَ مِنْهُ وَرَجَعْنَا عَنْهُ، وَتَرَكْنَاهُ وَأَرْضَهُ يَلِيهَا دُونَنَا، وَمَنْ أَبَى قَاتَلْنَاهُ أَبَدًا، حَتَّى نُفْضِيَ إِلَى مَوْعُودِ اللّٰهِ

''اللہ نے ہمیں بھیجا ہے' اور اللہ ہمیں تمہارے پاس اس لیے لائے ہیں کہ ہم اللہ کے حکم سے اس کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں' اور انہیں دنیا کی تنگی سے اس کی کشادگی کی طرف لے جائیں' اور انہیں مذاہبِ عالم کے ظلم وجور سے نکال کر اسلام کے عدل میں داخل کر دیں۔ پس اللہ عزوجل نے اپنا دین دے کر ہمیں اپنی مخلوق کی طرف بھیجا تا کہ ہم انہیں اللہ کی طرف دعوت دیں۔ پس جس نے یہ دعوت قبول کر لی تو ہم بھی اس کے اسلام کو قبول کریں گے اور یہاں سے واپس لوٹ جائیں گے۔ نہ صرف انہیں چھوڑ دیں گے بلکہ ان کی زمین بھی انہی کے پاس رہنے دیں گے۔ اور جس نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو ہم اس سے ہمیشہ کے لیے جنگ کریں گے یہاں تک کہ ہم اللہ کے وعدے کو پالیں۔''

پس اسلام میں جہاد کا مقصود صرف مسلمانوں پر سے ظلم کا خاتمہ نہیں' بلکہ انسانوں پر سے ظلم کا خاتمہ ہے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ انسانوں پر سے ظلم کا یہ خاتمہ وہی مسلمان کر سکتے ہیں جو خود ظالم نہ ہوں۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''اسلام جس جہاد کا حکم دیتا ہے' وہ خدا کی راہ میں جنگ ہے' اس لیے اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔''

غامدی صاحب کی یہ بات درست ہے کہ اسلام عین میدان جنگ میں بھی ہمیں اخلاقیات کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنے کا سختی سے حکم جاری کرتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الموطا''، امام شافعی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''مسند الشافعی''، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنی کتاب ''مسند احمد'' اور امام بخاری رحمہ اللہ اپنی کتاب ''صحیح بخاری'' میں ایسی احادیث لائے ہیں کہ جن میں اللہ کے رسول ﷺ نے عین حالتِ جنگ میں بھی غیر مسلم بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرما دیا۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ بالکل قطعی ہے کہ جہاد صرف مقاتلین (combatants) سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کا قانون یہی ہے کہ اگر کوئی زبان سے حملہ کرے گا تو اس کا جواب زبان سے دیا جائے گا' لڑنے والوں کی مالی مدد کرے گا تو اس کو مدد سے روکا جائے گا' لیکن جب تک وہ ہتھیار اٹھا کر لڑنے کے لیے نہیں نکلتا' اس کی جان نہیں لی جا سکتی۔ یہاں تک کہ عین میدان جنگ میں بھی وہ اگر ہتھیار پھینک دے تو اسے قیدی بنایا جائے گا' اس کے بعد اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔''

یہ بات درست ہے کہ جہاد صرف مقاتلین سے ہی ہوگا' لیکن مقاتلین کی جو تعریف غامدی صاحب نے بیان کی ہے' وہ محل نظر ہے۔ مقاتلین صرف ہتھیار اٹھانے والے نہیں ہوتے' بلکہ مقاتلین سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ میں شریک ہوں' چاہے ہتھیار اٹھا کر' چاہے ہتھیار چلا کر۔ آج کل کی صورت حال میں کسی بھی ملک کی سیکیورٹی فورسز' آرمی' نیوی اور فضائیہ میں ہتھیار چلانے والے یا دو بدو لڑنے والے تو کم ہی ہوتے ہیں' باقی ایک بڑی تعداد تو ان کے معاونین کی ہوتی ہے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''دورِ حاضر کے مغربی مفکّرین سے صدیوں پہلے قرآن نے اعلان کیا تھا کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (مسلمانوں کا نظم اجتماعی ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہوگا)۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت ان کے مشورے سے قائم ہوگی۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے گا۔ مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں گے۔''

مسلمانوں کی حکومت آپ مشورے سے وجود میں لے آئیں' کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن مشورہ دینے میں سب کے حقوق برابر ہوں گے' تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ مسئلہ کی نوعیت کو دیکھیں گے۔ اگر تو مسئلہ قومی ہے تو قوم سے مشورہ لیا جائے اور اگر علمی ہے تو اہلِ علم سے مشورہ کیا جائے اور فنی ہے تو اہلِ فن سے مشورہ لیا جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بدر' اُحد اور خندق کی جنگوں میں عام مشورہ لیا' کیونکہ مسئلہ قومی تھا کہ قوم نے ہی لڑنا تھا لہٰذا اسی سے مشورہ کیا گیا۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''جدید ریاست میں پارلیمان کا ادارہ اسی مقصد سے قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اسی کا ہے اور اس کا ہونا چاہیے۔ علماء ہوں یا ریاست کی عدلیہ'

پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہوسکتا۔''

ریاست میں پارلیمان کے ادارے کو ''شوریٰ'' بنالیں' اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے' لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ریاست کے نظام میں آخری سند پارلیمان ہے۔ اسلامی ریاست کے نظام میں آخری سند (supreme authority) کتاب وسنت ہیں جو تمام شہریوں کے دنیوی ودینی جملہ حقوق کی ادائیگی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ پارلیمان کو بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ نظام کی جو تعبیر اور صورت وہ پیش کر رہی ہے' وہ ظلم وزیادتی پر مبنی نہیں ہے۔ اور اگر پارلیمان کی کسی تعبیر سے شہریوں کے دنیوی یا دینی حقوق متاثر ہوں گے' تو انہیں اعلیٰ عدلیہ کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اب اعلیٰ عدلیہ اس بارے میں فیصلہ کرے گی کہ پارلیمان کا وضع کیا گیا نظام کہیں کتاب وسنت کے منافی تو نہیں ہے؟ اگر اعلیٰ عدلیہ یہ فیصلہ کر دے کہ پارلیمان کا وضع کردہ نظام کتاب وسنت کے منافی نہیں ہے تو اس کا فیصلہ ہر دو فریقین پر لاگو ہوگا۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے' اس سے ہٹ کر جو حکومت قائم کی جائے گی' وہ ایک ناجائز حکومت ہوگی' خواہ اس کے سربراہ کی پیشانی پر سجدوں کے نشان ہوں یا اسے امیر المؤمنین کے لقب سے نواز دیا جائے۔''

فریقِ مخالف کا مشورہ یہ ہے کہ غامدی صاحب کو اپنی رائے میں عاجز ہونا چاہیے۔ اگر وہ بھی فتویٰ کی زبان اور ترش اسلوب میں بات کرنا شروع کر دیں گے تو پھر انہیں اپنے ناقدین سے اسی قسم کے اسلوبِ بیان کا شکوہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ سوسائٹی میں علمی مکالمہ ہونا چاہیے' لیکن اس قسم کے الفاظ علمی مکالمہ کی بجائے ردِّعمل کی نفسیات کو جنم دیتے ہیں۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی حکومت اگر کسی جگہ قائم ہو تو اس سے بالعموم نفاذِ شریعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یہ تعبیر مغالطہ انگیز ہے' اس لیے کہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ شریعت کے تمام احکام ریاست کی طاقت سے لوگوں پر نافذ کر دے' حالانکہ قرآن وحدیث میں یہ حق کسی حکومت کے لیے بھی ثابت نہیں ہے۔ اسلامی شریعت میں دو طرح کے احکام ہیں' ایک جو فرد کو بحیثیت فرد دیے گئے ہیں' اور دوسرے جو مسلمانوں کے معاشرے کو دیے گئے ہیں۔ پہلی قسم کے احکام خدا اور بندے کے درمیان ہے اور وہ اس میں کسی حکومت کے سامنے نہیں بلکہ اپنے پروردگار ہی کے

سامنے جواب دہ ہے۔ لہٰذا دنیا کی کوئی حکومت اسے مثال کے طور پر' روزہ رکھنے یا حج عمرہ کے لیے جانے یا ختنہ کرانے یا مونچھیں پست رکھنے اور وہ اگر عورت ہے تو سینہ ڈھانپنے' زیب وزینت کی نمائش نہ کرنے یا اسکارف اوڑھ کر باہر نکلنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔ اس طرح کے معاملات میں تعلیم وتربیت اور تلقین ونصیحت سے آگے اس کے کوئی اختیارات نہیں ہیں' الا یہ کہ کسی کی حق تلفی یا جان' مال' آبرو کے خلاف زیادتی کا اندیشہ ہو۔ قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ دین کے ایجابی احکام میں سے یہ صرف نماز اور زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی اگر چاہے تو قانون کی طاقت سے کر سکتا ہے۔ رہے دوسری قسم کے احکام تو وہ درحقیقت دیے ہی حکومت کو گئے ہیں۔ اس لیے کہ اجتماعی معاملات میں وہی معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے۔ علماء اربابِ حل وعقد سے ان پر عمل کا مطالبہ کریں تو یقیناً حق بجانب ہوں گے اور اپنے منصب کے لحاظ سے ان کو کرنا بھی چاہیے۔ مگر یہ شریعت پر عمل کی دعوت ہے' نفاذِ شریعت کی تعبیر اس کے لیے بھی موزوں قرار نہیں دی جا سکتی۔''

غامدی صاحب نے دینی احکام کی جو دو قسمیں بیان کی ہیں' تو ان کی یہ تقسیم درست ہے۔ پہلی قسم کے بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ ان احکامات میں بندہ صرف اپنے پرودگار کو جواب دہ ہے' اِلا یہ کہ کسی کی حق تلفی یا جان ومال یا آبرو کے خلاف زیادتی ہو۔ یہ بات بھی درست ہے' لیکن اس میں ایک ضروری اضافے کے بغیر بات نامکمل ہے اور وہ اضافہ یہ ہے کہ اگر اس کے کسی فرد کے عمل سے معاشرے میں فتنہ اور فساد کی راہ کھلے گی تو اسے قانوناً روکا جائے گا۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر حکومت ایک عورت کو سینہ ڈھانپنے یا اسکارف پہننے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی ہے تو کیا حکومت اس کے بے لباس (nude) ہو کر عوامی مقامات پر گھومنے پھرنے کی صورت میں بھی صرف وعظ ونصیحت پر اکتفا کرے گی؟ اور اس صورت میں کسی کی کیا حق تلفی ہوتی ہے یا جان ومال کو نقصان پہنچتا ہے؟ پس صحیح موقف یہ ہے کہ حکومت ہر ایسے کام سے روکے گی اور اسے روکنا بھی چاہیے کہ جو معاشرے میں کسی بھی قسم کے دینی' اخلاقی یا روحانی بگاڑ کا سبب بنے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''مسلمان اپنے حکمرانوں کی رعایا نہیں' بلکہ برابر کے شہری ہوں گے اور قانون اور ریاست کی سطح پر ان کے بڑے اور چھوٹے اور شریف اور وضیع کے مابین کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا' ان کے جان ومال اور آبرو کو حرمت حاصل ہوگی' یہاں تک کہ حکومت

ان کی رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس بھی ان پر عائد نہیں کر سکے گی۔''

بہت ہی معتدل اور عمدہ بات ہے کہ اسلامی ریاست میں عام مسلمان اور حکمران برابر کے شہری ہوں گے اور حکومت شہریوں کی مرضی کے بغیر ان پر کسی بھی قسم کا ٹیکس عائد نہیں کر سکے گی۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''نمازِ جمعہ اور نمازِ عیدین کا اہتمام حکومت کرے گی۔ یہ نمازیں صرف انہی مقامات پر ادا کی جائیں گی جو حکومت کی طرف سے ان کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے۔ ان کا منبر حکمرانوں کے لیے خاص ہوگا۔ وہ خود ان نمازوں کا خطبہ دیں گے اور ان کی امامت کریں گے یا ان کی طرف سے ان کا کوئی نمائندہ یہ ذمہ داری ادا کرے گا۔ ریاست کی حدود میں کوئی شخص اپنے طور پر ان نمازوں کا اہتمام نہیں کر سکے گا۔''

حکمران ضرور نماز پڑھائیں' لیکن بات یہ ہے کہ وہ علمی' اخلاقی اور روحانی طور پر اپنے آپ کو اس کا اہل بھی تو ثابت کریں۔ اگر موجودہ صورت حال میں اس تجویز پر عمل کر لیا جائے تو دین چھوڑ معاشرہ بھی ایک تماشہ بن جائے گا۔ اب اگر جناب زرداری صاحب دارالعلوم کراچی میں عید کی نماز پڑھائیں اور مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب ان کے مقتدی ہوں' جناب نواز شریف صاحب بادشاہی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیں اور مولانا مفتی منیب الرحمٰن صاحب ان کے سامع ہوں اور جناب عمران خان صاحب فیصل مسجد کے امام ہوں اور مولانا فضل الرحمٰن ان کے مقتدی' تو کیا سین پارٹ ہوگا؟ اور پھر جہاں جناب الطاف بھائی کا خطبہ ہوگا اور جناب رحمان ملک کی تلاوت تو مقتدیوں کے پاس کیا نماز قضا کرنے کے علاوہ بھی کوئی چارہ ہوگا؟ جناب! عرض ہے کہ کیوں ایسی بیکار کی تجویزیں پیش کی جائیں کہ جن سے نماز جیسا اہم رکنِ دین ایک تماشہ بن کر رہ جائے۔ باقی اصلاح ہر طبقے کی ہونی چاہیے' اس سے کس کو انکار ہے؟ لیکن جس طرح سیاست دانوں کی اصلاح کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہاں ڈاڑھی والے بھرتی کر لیے جائیں' اسی طرح مولویوں کی اصلاح کا یہ کوئی طریقہ کار نہیں ہے کہ منبر و محراب پر سیاست دانوں کو بٹھا دیا جائے۔ ''لکل فنٍّ رجال'' ہر فن کے اپنے لوگ ہوتے ہیں جو اسے بہتر جانتے ہیں اور بہتر طور پر چلانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں' لہٰذا رجال کی اصلاح کی خواہش کا اظہار ان کی تربیت کا کوئی نظام قائم/تجویز کر کے ہونا چاہیے نہ کہ اکھاڑ پچھاڑ کے رستے۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''قانون نافذ کرنے والے ادارے اصلاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارے

ہوں گے۔ چنانچہ معاشرے میں سے صالح ترین افراد ان اداروں کے لیے کارکنوں کی حیثیت سے منتخب کیے جائیں گے۔ وہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کریں گے اور ان سب چیزوں سے روکیں گے جنہیں انسان ہمیشہ سے برائی سمجھتا رہا ہے۔ تاہم قانون کی طاقت اسی وقت استعمال کریں گے جب کوئی شخص کسی کی حق تلفی کرے گا یا اس کی جان و مال یا آبرو کے خلاف کسی اقدام کے درپے ہوگا۔''

غامدی صاحب کی یہ تجویز اچھی ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کریں اور اس مقصد کے لیے باقاعدہ صالح ترین افراد کا انتخاب کیا جائے۔ لیکن قانون کی طاقت استعمال کرنے کی صورتوں میں یہاں بھی ہم وہی اضافہ کریں گے جو پیچھے کر چکے ہیں کہ اُس صورت میں بھی یہ ادارے قانون کی طاقت استعمال کریں گے کہ جس سے معاشرے میں کسی بھی قسم کے فتنہ یا فساد کے پھیل جانے کا اندیشہ ہو۔

۞ محترم غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''قتل اور فساد فی الارض کے سوا موت کی سزا کسی جرم میں بھی نہیں دی جائے گی۔ نیز ریاست کا کوئی مسلمان شہری اگر زنا' چوری' قتل' فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی' خاندانی اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہے تو اس پر وہ سزائیں نافذ کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔''

غامدی صاحب کی یہ بات درست ہے کہ قتل اور فساد فی الارض میں موت کی سزا دی جائے' لیکن اس کے علاوہ بھی بعض جرائم ایسے ہیں کہ جن کی سزا شریعت اسلامیہ میں موت مقرر کی گئی ہے' جیسا کہ شادی شدہ مرد یا عورت اگر زنا کا ارتکاب کریں اور ان کا یہ جرم ثابت ہو جائے تو اس کی سزا بھی رجم ہے۔ اسی طرح غامدی صاحب کی طرف سے زنا' چوری' قتل اور قذف کے جرائم میں بیان کردہ قرآنی سزاؤں کے نفاذ کی بات بھی قابل تعریف ہے۔ بس ان جرائم میں اللہ کے رسول ﷺ نے ایک اور جرم کا اضافہ فرمایا اور وہ شراب نوشی ہے۔ شراب نوشی کی صورت میں بھی چالیس یا اسّی کوڑوں کی سزا جاری کی جائے گی' جیسا کہ دونوں طرح کی روایات موجود ہیں۔ اور مجرم کے جرم پر اصرار اور اس جرم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فساد کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے جج ان دونوں میں سے کوئی بھی سزا نافذ کر سکتا ہے۔

❁❁❁

مسلم وحدت: مابین فقہائے اسلام و غامدی

حامد کمال الدین ☆

ای میل پر ایک دوست نے روزنامہ جنگ (۲۲ جنوری) کا ایک مضمون بھیجا اور مشورہ دیا کہ اس میں پیش کیے گئے بعض مغالطوں پر کچھ لکھ دیا جائے۔ مضمون کا عنوان ہے ''اسلام اور ریاست: ایک جوابی بیانیہ'' مؤلفہ جاوید احمد غامدی۔ (http://goo.gl/0yWPD0) تفصیلی گفتگو تو ظاہر ہے یہاں ممکن نہیں، حتیٰ کہ سب نکات کو زیر بحث لانا بھی ممکن نہیں۔ ان میں سے ہر موضوع ایک تفصیل چاہتا ہے، جس کا یہ مقام نہیں۔ یہاں فی الوقت ''مسلم وحدت'' کے موضوع پر ان کا فقہاء کی بابت ایک دعویٰ ہمارے زیر غور آئے گا۔ لکھتے ہیں:

> ''جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ اپنی ایک ریاست ہائے متحدہ قائم کرلیں۔ یہ ہم میں سے ہر شخص کا خواب ہوسکتا ہے اور ہم اس کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی جدوجہد بھی کرسکتے ہیں، لیکن اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم ہے جس کی خلاف ورزی سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہرگز نہیں، نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔ پہلی صدی ہجری کے بعد ہی، جب مسلمانوں کے جلیل القدر فقہاء ان کے درمیان موجود تھے، ان کی دو سلطنتیں، دولت عباسیہ بغداد اور دولت امویہ اندلس کے نام پر قائم ہوچکی تھیں اور کئی صدیوں تک قائم رہیں، مگر ان میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا، اس لیے کہ اس معاملے میں سرے سے کوئی حکم قرآن وحدیث میں موجود ہی نہیں ہے۔''

خط کشیدہ الفاظ فقہائے اسلام کی بابت ایک دعویٰ ہے۔ مضمون نگار پاکستان کے غیر علماء طبقہ میں بے شک ایک بڑی مقبولیت رکھتے ہیں، جس کے بے شمار اسباب ہوں گے۔ لیکن طبقۂ علماء کے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کوئی وجہ ہونی چاہیے کہ ایک فکر کی بابت علمائے

☆ مدیر ماہنامہ ''ایقاظ'' لاہور hamidateeqaz@gmail.com

شریعت کے ہاں غیر علماء طبقہ کی نسبت ایک یکسر مختلف رائے پائی جائے اور وہ اس کا کوئی علمی وزن لگانے پر آمادہ نہ ہوں۔ ایک جیالا ذہن (جو دنیوی علوم میں بے شک بہت پڑھا لکھا ہوگا) اِس ظاہرہ phenomenon کی تفسیر میں وہ بنیاد بھی اختیار کرنے چلا جاتا ہے جو مسیح علیہ السلام نے علمائے بنی اسرائیل کی بابت اختیار فرمائی تھی، اور جس کی ہمسری میں مرزا قادیانی نے علمائے اُمت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت ایک مخصوص لہجہ اور ذہن بھی تشکیل دے ڈالا۔ تاہم یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ ہمارے ملک کے تقریباً تمام علمائے اسلام بلاتفریق مکاتب فکر ''المورد'' نام سے سامنے آنے والے ایک نئے ڈسکورس کا علمی وزن لگانے پر آمادہ کیوں نہیں ہیں۔ کم فہمی کا عارضہ لاحق ہے یا کتمانِ حق ہو رہا ہے؟ آخر کچھ تو ہے۔ چند ایک کی بات بھی نہیں ہو رہی، آخر سبھی علماء کو کیا ہوگیا ہے؟ یا مسئلہ خود اِس نئے ڈسکورس کے ساتھ ہے؟ کسی ایک جانب کچھ مسئلہ ضرور ہے، اور کسی ایک کو معاملے پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔

''مسلم وحدت'' کے موضوع پر فقہائے اسلام کے متعلق کیے گئے اِس دعویٰ سے ہی آپ کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ حدیث یا فقہ پر مضمون نگار کے خیالات طبقۂ علماء کے ہاں توجہ نہیں پاتے تو اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے: ''مسلمانوں کی دو سلطنتیں، دولتِ عباسیہ بغداد اور دولتِ امویہ اندلس کے نام پر قائم ہوچکی تھیں اور صدیوں تک قائم رہیں، مگر ان (فقہاء) میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا''۔ کیا واقعتاً فقہاء میں سے ''کسی نے'' اسے اسلامی شریعت کے ''کسی حکم'' کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا؟ معلوم ہوتا ہے ''مسلم وحدت'' کے مسئلہ پر فقہاء کی آراء فاضل مضمون نگار کی نظر سے نہیں گزریں۔ ورنہ زیادہ سے زیادہ وہ اپنی اِس بات کو فقہاء کے ہاں پائی جانے والی ایک ''شاذ رائے'' کہتے، جیسا کہ الماوردی رحمہ اللہ نے اس کے ''شاذ رائے'' ہونے کی باقاعدہ صراحت فرمائی ہے (الماوردی کی عبارت آگے آرہی ہے)۔ البتہ یہ بیان دے ڈالنا کہ فقہاء میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا، کتب فقہ پر مطلع طبقے کے یہاں تعجب سے سنا جائے گا۔ یہاں ہم فقہاء کے کچھ بیانات آپ کے سامنے رکھیں گے۔ اس سے آپ جائزہ لے سکتے ہیں، فقہاء کی بابت فاضل مضمون نگار کی یہ سٹیٹمنٹ فقہاء کے مواقف پر کس درجے کی نظر رکھنے کی غمازی کرتی ہے۔

فقہاء کے اقتباسات دینے سے پہلے البتہ ہم اس مسئلہ پر فقہاء کے ڈسکورس کی کچھ وضاحت کردینا چاہیں گے، علمائے فقہ ان شاء اللہ ہماری اس بات کی توثیق کریں گے:

''سلطانِ متغلِب'' کی طرح بہت سی چیزوں کو‘ کسی خاص زمان ومکان کے لیے‘ فقہاء نے ''امر واقعہ'' کے طور پر ضرور قبول کیا ہے: مفسدت کو دفع کرنے کے باب سے‘ یا کچھ راجح وضروری تر مصالح کو مقدم کرنے کے باب سے۔ یا ایک چیز کے لیے صورت حال کو ناہموار و ناسازگار جاننے کے باب سے (کہ جس میں ایک چیز پر اُمت سے عمل کروانا۔ بوجوہ ممکن نہیں ہوتا۔ البتہ اس کو کرنے کی صورت میں امت کے کچھ فوری وضروری امور ضرور تعطل کا شکار ہو سکتے ہیں یا معاملہ خونریزی کا موجب ہوسکتا ہے)۔ یعنی امت کی سطح پر ایک بات کی ''استطاعت'' نہ پائی جانا۔ یا ایک بات کا اصولاً مطلوب ہونے کے باوجود ایک ''دی ہوئی صورتحال'' میں مضرت رساں نظر آنا۔ اِسی چیز کو ضرورت یا اضطرار کے احکام بھی کہا جاتا ہے۔ پس ایک اصولاً درست مسئلہ پر بھی امت میں کوئی فتنہ کھڑا نہ ہونے دینا (کیونکہ فتنہ کو دفع کرنا بہرحال ضروری اور ہر چیز پر مقدّم ہے‘ خواہ وہ خلافت کا مسئلہ کیوں نہ ہو) فقہاء کے ہاں ایک نہایت قوی اعتبار ضرور ہے۔ چنانچہ کسی معاملہ میں ''احکامِ ضرورت'' لاگو کرتے ہوئے ایک چیز کو ''امر واقعہ'' کے طور پر قبول کرنا☆ اور چیز ہے مگر اسے ''اسلامی شریعت کی خلاف ورزی'' قرار نہ دینا بالکل اور چیز۔ جیسا کہ ہم نے مثال دی‘ ''سلطانِ متغلّب'' کو ''امر واقعہ'' کے طور پر تو فقہاء بے شک قبول کرلیں گے‘ یہاں تک کہ اُمت کے مصالح (مانند جہاد‘ اقامت عدل‘ نفاذِ شریعت اور امن واستقرار) کو معطل نہ ٹھہرانے کے باب سے سلطانِ متغلب کے احکامات پر عمل درآمد اور اس کے ساتھ مل کر جہاد کو بھی لازم ٹھہرا دیں گے‘ فتنہ وخونریزی کا دروازہ بند رکھنے کے باب سے اس کے خلاف خروج کو بھی منع ٹھہرا دیں گے (فقہاء کی بڑی تعداد کا موقف).....لیکن ''سلطانِ متغلب'' کو شرعاً جائز و ناقابلِ اعتراض ٹھہرا دیں‘ یہ ممکن

☆ جس طرح ہمارے فاضل مضمون نگار ''قراردادِ مقاصد'' والے ''اسلامی'' و ''مذہبی'' پاکستان کو احکامِ ضرورت کے باب سے قبول کریں گے جبکہ اصولاً اس کو مسترد کر دیں گے! یا جیسے اگر یہ سعودی عرب یا کویت وغیرہ میں ہوتے تو ''بادشاہت'' کو امر واقعہ کے طور پر قبول کرتے‘ اس کے احکامات پر عمل درآمد اور اس کے خلاف عدم بغاوت ہی کا فتویٰ دیتے۔ بادشاہ کے خلاف خروج کرنے والے کو باغی کہتے۔ لیکن اس کا مطلب ظاہر ہے یہ نہ ہوتا کہ وہ ''بادشاہت'' یا ''شخصی استبداد'' کو شریعت کی خلاف ورزی نہیں مانتے۔ غرض یہ ہمارے ساتھ اتفاق کریں گے کہ ایک چیز کو امر واقعہ کے طور پر قبول کرنا‘ حتیٰ کہ اس کو کچھ شرعی احکام بھی دے دینا اسے اصولاً ''شریعت کی خلاف ورزی'' قرار دینے کے ساتھ متعارض نہیں۔

نہیں۔ جس کا خود بخود مطلب ہے‘ قدرت واستطاعت ہونے کی صورت میں سلطانِ متغلب کو رد کرنا ہی فقہاء کے نزدیک شریعت کا تقاضا ہوگا۔ ایسا ہی معاملہ ''دولت اسلامی کے انقسام'' کا ہے۔ اسلامی قلمرو کے ٹکڑے ہونا فقہاء کے ہاں اصولاً احکامِ شریعت کی خلاف ورزی ہی ہے اگرچہ عدم استطاعت یا دفعِ فتنہ کے باب سے اِس صورتحال کو بدلنے پر عامۃ الناس کو اکسانا کسی وقت ممنوع کیوں نہ ٹھہرا دیا جائے۔ جیسا کہ ہمارے اِس دور کے علماء کی اکثریت بھی متقدمین کی راہ پر چلتے ہوئے ''خلافت'' یا ''دین کی پابند حکومت'' لانے کی خاطر شورش اور بدامنی برپا کرنے کو ممنوع ہی ٹھہراتی ہے‘ جو کہ حق ہے۔

تو پھر آیئے دیکھتے ہیں‘ مؤلفینِ فقہاء ''اسلامی قلمرو کے انقسام پر'' اپنے قبیلے کے مواقف کیونکر نقل کرتے ہیں۔ واضح رہے‘ یہاں ہم ان فقہاء کے اقوال دیں گے جو اس ''انقسامِ خلافت'' ہی کے ادوار میں پائے گئے۔ یعنی یہ معاملہ بطورِ واقعہ بھی ان کی نظر میں ہی تھا اور وہ کسی سہانے دور میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں نہیں کر رہے تھے۔ دیکھئے یہ فقہاء اِس موضوع پر کیا کہتے ہیں:

سیاستِ شرعیہ پر قلم اٹھانے والا ایک بڑا نام الماوردی رحمۃ اللہ علیہ (چوتھی صدی ہجری کے فقیہہ‘ اپنے وقت کے قاضی القضاۃ) لکھتے ہیں:

وذهب الجمهور الى ان اقامة امامين فى عصر واحد لا يجوز شرعا لما روى عن النبى ﷺ انه قال : اذا بويع اميران فاقتلوا احدهما [1]

''جمہور کا مذہب رہا ہے: ایک زمانے میں دو اماموں کا مقرر ہونا شرعاً جائز نہیں ہے‘ کیونکہ نبی ﷺ سے مروی ہے: جب دو امیروں کی بیعت ہو جائے تو ان میں سے ایک کو قتل کر دو۔''

ماوردی کی مندرجہ بالا نقل غور فرمالیجئے: جمہور کا مذہب۔

ماوردی رحمۃ اللہ علیہ اُمت میں ''ایک وقت میں مسلمانوں کے دو ملک یا دو امیر'' ہونے کے جواز کو ایک شاذ قول قرار دیتے‘ اور امت میں ایک ہی امارت کو ضروری ٹھہراتے ہوئے:

وإذا عقدت الإمامة لإمامين فى بلدين لم تنعقد إمامتهما‘ لأنه لا يجوز أن يكون للأمة إمامان فى وقت واحد وإن شذ قوم فجوزوه [2]

''اگر دو مختلف ملکوں میں دو امیروں کو امامت سونپی جائے تو ان دونوں کی امامت منعقد نہ ہوگی۔ کیونکہ ایک وقت میں امت کے دو امام جائز نہیں‘ اگرچہ بعض لوگوں نے شذوذ کی راہ چلتے ہوئے اسے جائز کہا ہے۔''

یہ جمہور فقہاء، جن کا الماوردی و دیگر مؤلفین کے بیان میں ذکر ہوا، اس قدر زیادہ ہیں کہ نووی رحمۃ اللہ علیہ (ساتویں صدی ہجری) اس کو ''علماء کا متفقہ قول'' ہی قرار دینے تک چلے جاتے ہیں۔ تاہم نوویؒ کی تقریر دینے سے پیشتر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صحیحین کی وہ روایت نقل کر دی جائے جس کے تحت (شرح مسلم میں) نوویؒ فقہاء کا یہ اتفاق نقل کرتے ہیں۔ کیونکہ خود یہ حدیث بھی اس باب میں معانی کا ایک سمندر ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَاِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَتَكُوْنُ خُلَفَاءُ وَتَكْثُرُ)) قَالُوْا: فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ :((فُوا بِبَيْعَةِ الْاَوَّلِ فَالْاَوَّلِ، وَاَعْطُوْهُمْ حَقَّهُمْ، فَاِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ)) (۳)

''بنی اسرائیل کے معاملاتِ سیاست انبیاء چلاتے رہے، جیسے ہی کوئی نبی دنیا سے جاتا اس کا جانشین نبی ہوتا۔ اب یقیناً میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ ہاں خلفاء ہوں گے اور بہت زیادہ ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کی: تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: جس کی بیعت پہلے ہو جائے اُسی کی بیعت نبھاتے چلے جانا۔ تم ان کو ان کا حق دیتے رہنا، کیونکہ اللہ نے جو کچھ ان کی رعیت میں دیا اُس کی بابت اُن سے وہ خود سوال کرنے والا ہے۔''

حدیث بالا کی شرح میں نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى أَنَّهُ لَا يَجُوزُ أَنْ يُعْقَدَ لِخَلِيفَتَيْنِ فِي عَصْرٍ وَاحِدٍ سَوَاءٌ اتَّسَعَتْ دَارُ الْإِسْلَامِ أَمْ لَا، وَقَالَ إِمَامُ الْحَرَمَيْنِ فِي كِتَابِهِ الْإِرْشَادِ قَالَ أصحابنا لا يجوز عقدها لشخصين قَالَ وَعِنْدِي أَنَّهُ لَا يَجُوزُ عَقْدُهَا لِاثْنَيْنِ فِي صُقْعٍ وَاحِدٍ وَهَذَا مُجْمَعٌ عَلَيْهِ، قَالَ فَإِنْ بَعُدَ مَا بَيْنَ الْإِمَامَيْنِ وَتَخَلَّلَتْ بَيْنَهُمَا شُسُوعٌ فَلِلِاحْتِمَالِ فِيهِ مَجَالٌ، قَالَ وَهُوَ خَارِجٌ مِنَ الْقَوَاطِعِ، وَحَكَى الْمَازِرِيُّ هَذَا الْقَوْلَ عَنْ بَعْضِ الْمُتَأَخِّرِينَ مِنْ أَهْلِ الْأُصُولِ وَأَرَادَ بِهِ إِمَامَ الْحَرَمَيْنِ وَهُوَ قَوْلٌ فَاسِدٌ مُخَالِفٌ لِمَا عَلَيْهِ السَّلَفُ وَالْخَلَفُ وَلِظَوَاهِرِ إِطْلَاقِ الْأَحَادِيثِ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ (٤)

''علماء کا اتفاق ہے، ایک زمانے میں دو خلیفے نہیں ہو سکتے خواہ دار الاسلام کا رقبہ بہت وسیع ہو یا نہ ہو۔ امام الحرمین (جوینی) نے اپنی کتاب الارشاد میں ذکر کیا کہ ہمارے (شافعیہ کے) اصحاب کا یہی مذہب ہے کہ امارت (بیک وقت) دو شخصوں کے لیے

منعقد نہیں ہو سکتی۔ لیکن جوینی کا اپنا کہنا ہے کہ میرے نزدیک کسی ایک خطے میں دو آدمیوں کی امارت تو منعقد نہیں ہو سکتی اور اس پر تو اجماع ہے، البتہ اگر دو امیروں کے مابین مسافت بہت زیادہ ہو اور ان دونوں کے بیچ میں بہت سے علاقے پڑتے ہوں تو یہاں احتمالات کی گنجائش ہے اور (اس صورت میں) یہ قطعیات میں نہیں آتا۔ مازری نے یہی قول کسی متاخر سے نقل کیا ہے۔ اس متاخر سے مازری کی مراد امام الحرمین (جوینی) ہی ہیں۔ مگر یہ قول فاسد ہے، سلف تا خلف جو مذہب رہا ہے یہ اس سے متصادم ہے۔ نیز یہ احادیث کے ظواہر سے متصادم ہے۔ واللہ اعلم۔''

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا دعوائے اجماع: جس کے ''اجماع'' ہونے سے آپ بے شک اتفاق نہ کریں، مگر اس سے آپ کو یہ ضرور اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس قول پر فقہاء کی کتنی بڑی تعداد ہے، جس کے متعلق ہمارے فاضل مضمون نگار کا خیال ہے ''فقہاء میں سے کسی نے اسے شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی ہی قرار نہیں دیا''۔ ابن حزم:

واتفقوا أنه لا يجوز أن يكون على المسلمين في وقت واحد في جميع الدنيا إمامان، لا متفقان ولا مفترقان، ولا في مكانين ولا في مكان واحد (٥)

''نیز اس پر اجماع ہوا ہے کہ: مسلمانوں پر ایک وقت میں پوری دنیا کے اندر دو امام ہونا ناجائز ہے، خواہ وہ امام اکٹھے ہوں یا متفرق۔ یہ نہ دو الگ الگ جگہوں میں جائز ہے اور نہ ایک جگہ میں۔''

ابن حزمؒ (پانچویں صدی ہجری) کے مندرجہ بالا بیان پر ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (ساتویں صدی ہجری) اتنا سا استدراک کرتے ہیں کہ اس سے اختلاف کرنے والے بعض اہلِ کلام ضرور ہیں۔ نیز (احکامِ ضرورت کے تحت) ہر دو مملکت کے احکامات پر عملدرآمد ہوگا۔ البتہ جہاں تک ہر دو فرماں روا کی حکومت کو ''جائز'' ماننے کا تعلق ہے تو اس کو غلط کہنے پر امت کا اتفاق ہے:

النزاع في ذلك معروف بين المتكلمين في هذه المسألة كأهل الكلام والنظر، فمذهب الكرامية وغيرهم جواز ذلك، وأن عليًا كان إمامًا ومعاوية كان إمامًا، وأما أئمة الفقهاء فمذهبهم أن كلاً منهم ينفذ حكمه في أهل ولايته كما ينفذ حكم الإمام الواحد، وأما جواز العقد لهما فهذا لا يفعل مع اتفاق الأمة (٦)

''اس پر اہلِ کلام و فلسفہ ایسے متکلمین اختلاف معروف ہے۔ کرامیہ وغیرہ فرقے اس

کے جواز کے قائل ہیں' اور یہ کہ علیؓ بھی امام تھے اور معاویہؓ بھی امام تھے۔ البتہ جہاں تک ائمہ فقہاء (اہلِ سُنّت) کا تعلق ہے تو ان کا مذہب ہے کہ ہر دو امیر کا حکم اپنی اپنی قلمرو میں اسی طرح نافذ ہوگا جس طرح ایک امام کا ہوتا ہے۔ ہاں جہاں تک اس کو جائز کہنے کا تعلق ہے تو امت کا اتفاق ہے کہ دونوں کو بیک وقت امارت سونپنا صحیح نہیں۔''

روئے زمین پر مسلمانوں کا ایک امیر ضروری قرار دینے پر مذاہبِ اربعہ

ساداتِ حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم:

مَا افْتَرَقَ فِيهِ الْإِمَامَةُ الْعُظْمَى وَالْقَضَاءُ يُشْتَرَطُ فِي الْإِمَامِ أَنْ يَكُونَ قُرَشِيًّا بِخِلَافِ الْقَاضِي وَلَا يَجُوزُ تَعَدُّدُهُ فِي عَصْرٍ وَاحِدٍ وَجَازَ تَعَدُّدُ الْقَاضِي وَلَوْ فِي مِصْرٍ وَاحِدٍ (۷)

''کن چیزوں میں امامت عظمیٰ قضاء سے مختلف ہے: امام کا قریش سے ہونا شرط ہے برخلاف قاضی کے۔ نیز امام ایک زمانے میں متعدد ہونا جائز نہیں جبکہ قاضی متعدد ہونا جائز ہے' خواہ ایک ہی شہر میں کئی قاضی ہوں۔''

فَإِذَا اجْتَمَعَ عَدَدٌ مِنَ الْمَوْصُوفِينَ فَالْإِمَامُ مَنِ انْعَقَدَ لَهُ الْبَيْعَةُ مِنْ أَكْثَرِ الْخَلْقِ وَالْمُخَالِفُ لِأَكْثَرِ الْخَلْقِ بَاغٍ يَجِبُ رَدُّهُ إِلَى انْقِيَادِ الْمُحَقِّ (۸)

''اگر امام بننے کی صفات کے متعدد حاملین بیک وقت سامنے آئیں تو ان میں امام وہ ہوگا جسے اکثر مخلوق نے بیعت دی ہو۔ اکثر مخلوق کی بیعت (سے بننے والے امام) کے مقابلے پر امام بننے والا باغی ہوگا اور اس کو حق کی تابعداری پر واپس لانا واجب ہوگا۔''

ساداتِ مالکیہ رحمۃ اللہ علیہم:

(تَنْبِيهٌ) أَشْعَرَ مَا ذَكَرَهُ الْمُصَنِّفُ مِنْ جَوَازِ تَعَدُّدِ الْقَاضِي بِمَنْعِ تَعَدُّدِ الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ وَهُوَ كَذَلِكَ وَلَوْ تَبَاعَدَتِ الْأَقْطَارُ جِدًّا لِإِمْكَانِ النِّيَابَةِ وَقِيلَ بِالْجَوَازِ إِذَا كَانَ لَا يُمْكِنُ النِّيَابَةُ لِتَبَاعُدِ الْأَقْطَارِ (۹)

''نوٹ: مصنف نے متن میں جو بیان کیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ: قاضی کا متعدد ہونا جائز اور امام کا متعدد ہونا منع ہے۔ اور ہے بھی ایسا' اگرچہ خطے بہت دور کیوں نہ ہوں'

کیونکہ (دور کے خطے میں) امام کی نیابت ہوسکتی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اُس صورت میں جائز ہے جب خطوں کے مابین اتنا بعد ہو کہ نیابت ممکن ہی نہ رہے۔''

ساداتِ شافعیہ رحمۃ اللہ علیہم:

(وَلَا يَجُوزُ عَقْدُهَا لِإِمَامَيْنِ) فَأَكْثَرَ وَلَوْ بِأَقَالِيمَ (وَلَوْ تَبَاعَدَتِ الْأَقَالِيمُ) لِمَا فِي ذَلِكَ مِنَ اخْتِلَافِ الرَّأْيِ وَتَفَرُّقِ الشَّمْلِ (فَإِنْ عُقِدَتَا) أَيِ الْإِمَامَتَانِ لِاثْنَيْنِ (مَعًا بَطَلَتَا أَوْ مُرَتَّبًا انْعَقَدَتْ لِلسَّابِقِ) كَمَا فِي النِّكَاحِ عَلَى امْرَأَةٍ (وَيُعَزَّرُ الْآخَرُونَ) أَيِ الثَّانِي وَمُبَايِعُوهُ (إِنْ عَلِمُوا) بَيْعَةَ السَّابِقِ لِارْتِكَابِهِمْ مُحَرَّمًا. (۱۰)

''دو یا دو سے زیادہ اماموں کے لیے امارت کا انعقاد جائز نہیں' چاہے خطے الگ الگ کیوں نہ ہوں' چاہے خطے دور دور کیوں نہ ہوں' کیونکہ اس میں آراء کے بٹ جانے اور شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ واضح ہے۔ اگر دو امامتیں دو اشخاص کے لیے ایک ہی وقت میں منعقد کر دی گئی ہوں تو وہ دونوں باطل ہوں گی۔ اور اگر آگے پیچھے منعقد ہوئیں تو جس کی پہلے ہوئی اس کی منعقد ہو جائے گی۔ جس طرح کہ (مختلف ولیوں کے ہاتھوں) عورت کے ایک سے زیادہ نکاح کا معاملہ ہوتا ہے۔ جبکہ بعد والے اور اس کی بیعت کرنے والوں کو سزا دی جائے گی بشرطیکہ ان کو پہلے والے کی بیعت کا علم ہو گیا ہو' اس لیے کہ ایک حرام کے مرتکب ہوئے۔''

ساداتِ حنابلہ رحمۃ اللہ علیہم:

(ويتجه) أنه (لا يجوز تعدد الإمام) لما قد يترتب عليه من التنافر المفضي إلى التنازع والشقاق ووقوع الاختلاف في بعض الأطراف' وهو مناف لاستقامة الحال' يؤيد هذا قولهم: وإن تنازع في الإمامة كفؤان أقرع بينهما إذ لو جاز التعدد لما احتيج إلى القرعة. (۱۱)

''اس کی توجیہہ یوں ہے کہ: متعدد امام ہونا جائز نہیں۔ اس لیے کہ اس سے باہمی منافرت پیدا ہوتی ہے جو کہ باہمی نزاع اور جدائی کا باعث بننے والی ہے اور (امت کے) اطراف کے مابین اختلاف لے آنے کا موجب۔ جبکہ یہ چیز راست روی کے منافی ہے۔ اس کی تائید فقہاء کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ اگر امامت کے اہل دو اشخاص میں تنازع ہو جائے تو ان دونوں کے مابین قرعہ ڈالا جائے گا۔ ظاہر ہے اگر تعدد جائز ہوتا تو قرعہ کی ضرورت نہ ہوتی۔''

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر:

والسنة أن يكون للمسلمين إمام واحد والباقون نوابه فإذا فرض أن الأمة خرجت عن ذلك لمعصية من بعضها أو عجز من الباقين أو غير ذلك فكان لها عدة أئمة لكان يجب على كل إمام أن يقيم الحدود ويستوفي الحقوق (۱۲)

''سُنّت (دستور) یہی ہے کہ جملہ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور باقی اس کے نائب ہوں۔ ہاں اگر کسی وقت امت اس دستور سے ہٹ جائے خواہ اِس وجہ سے کہ امت کے کچھ لوگ معصیت کی راہ چل پڑے ہیں اور باقی لوگ بے بس ہو گئے ہیں یا کسی اور وجہ سے امت کے ہاں متعدد امام ہو گئے ہیں' تو یہاں ہر امام پر واجب ہوگا کہ وہ حدود قائم کرے اور حقوق کو یقینی بنائے۔''

فقہاء کے درج بالا اقوال میں آپ دیکھتے ہیں: احکامِ ضرورت بھی ایک ساتھ ذکر ہو گئے اور احکامِ اصلی بھی۔ یہی توازن شاید آج ہمارے لوگوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بدترین سے بدترین حالات میں بھی احکامِ اصلی پر ہی مصر رہنا ایک یوٹوپیا (غیر حقیقت پسندانہ) روش کو جنم دیتا ہے' جو کہ لامحالہ انتہا پسندی کی صورت دھارتا ہے۔ اِسی کو ہم ''غلو'' یا ''افراط'' کہتے ہیں۔ غیر علماء طبقہ میں یہ روش بھی اِس وقت عروج پر ہے۔ دوسری طرف احکامِ اصلی کو سرے سے گول کر جانا ''جفا'' کا راستہ ہے جسے ہم ''تفریط'' کہتے ہیں اور جس پر ہمیں صاحب مضمون دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ اُمت بیچاری ان دو انتہاؤں کے بیچ کٹی پھٹی جاتی ہے۔ ہر انتہا پسند طبقہ' خواہ وہ اِفراط کی راہ چل رہا ہو یا تفریط کی' اپنا 'بیانیہ' (narrative) ہی جاری کر دینے پر مُصر ہے! اِس ملک کو یہ سب مل کر کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ اِس سے پہلے بھی تو آخر ہم یہاں بستے چلے آئے ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے خوب کیا جو یہاں فقہاء کا ذکر ضروری جانا۔ اس سے فقہاء کا موقف سامنے آنے میں بھی مدد ملی اور فقہاء کے مواقف پر خود ان کا مطلع ہونا بھی۔ ورنہ نیریٹو (narrative) جاری کرنے کے لیے ''فقہاء'' کی کیا ضرورت تھی!

حواشی

(۱) ادب الدنیا والدین' ص ۱۳۶۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/YQKAEQ

(۲) الأحكام السلطانية ص' ۲۹۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/M3Tbt1

(۳) متفق علیہ' واللفظ لمسلم http://goo.gl/sYrcmm

(٤) شرح مسلم' حدیث رقم ١٤٤٢۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/nNJSrc

(٥) مراتب الإجماع' مؤلفه ابن حزم' ص ١٢٤۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/ljmDcY

(٦) نقد مراتب الإجماع' مؤلفه ابن تيميه' ص ٣٢٥۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/lROiOW

(٧) الأشباه والنظائر لابن نجيم' ج١' ص ٣٢٥۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/AdNKiy

(٨) غمز عيون البصائر' للحموی' ج٤' ص ١١١۔ حوالہ کا ویب لنک http://goo.gl/FXUkZa

(٩) حاشية الدسوقی' ج٤' ص ١٣٤۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/gsy8MG : http

(١٠) أسنى المطالب في شرح روض الطالب' ج٤' ص ١١٠۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/9dn0n6

(١١) مطالب أولی النهی' ج٦' ص ٢٦٣۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/jqBi9S

(١٢) ..... مجموع فتاوی ابن تيمية' ج ٣٤' ص ١٧٥' ١٧٦۔ حوالہ کا ویب لنک: http://goo.gl/ZZJEvW

مجلّہ صفدر کا نافع نمبر

محقق اہلِ سنت' وکیل صحابہ واہلِ بیت' حضرت مولانا محمد نافع رحمۃ اللہ علیہ

[فاضل دیوبند..... مصنف: ''فوائد نافعه'' و ''رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ'']

کی یاد میں ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

جملہ اہلِ علم وقلم سے بالعموم اور حضرتؒ کے متعلقین اور مستفیدین سے بالخصوص گزارش ہے کہ اپنے تاثرات' تعزیتی پیغامات اور مضامین و مقالات درج ذیل پتے پر ارسال فرمائیں۔ جزاکم اللّٰہ احسن الجزاء۔ نیز جن حضرات کے پاس حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات' ملفوظات' اِفادات یا کسی بھی قسم کی تحریرات محفوظ ہوں وہ ان کی صاف ستھری فوٹو سٹیٹ ارسال فرمائیں۔ ان شاء اللہ ان کے شکریہ کے ساتھ شاملِ اشاعت کی جائیں گی۔

دفتر ماہنامہ صفدر' مولانا احسن خدامی' مکان نمبر 4' گلی نمبر 84' محلّہ سردار پورہ' اچھرہ' لاہور

0334-0312-4612774 — 0307-5687800

ای میل ایڈریس: khadim-khan4@yahoo.com

پارلیمنٹ کے فیصلوں سے انکار کیوں؟

انصار عباسی

''اسلام اور ریاست کے عنوان پر ایک جوابی بیانیہ'' پڑھنے کا موقع ملا' جس میں صاحبِ مضمون نے ایک ایسے اسلام کا تصور پیش کیا جو مسلمانوں کے ایک قوم یا اُمّہ کے تصور کی نفی اور ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹے مسلمانوں کی وکالت کرتا ہے' جہاں ریاست کے اسلامی ہونے کو رد کیا گیا ہو اور مغربی جمہوریت کے تصور کی حمایت کی جاتی ہو' جو خلافت کو کوئی دینی اصطلاح ماننے سے انکاری ہو' جہاں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے مقرر کی گئی سزاؤں میں سے کچھ کو چُن لیا جائے اور باقیوں کو رد کر دیا جائے۔ میں ذاتی طور پر ایسے تصورِ اسلام سے اختلاف کرتا ہوں۔ ان صاحب کو پڑھ کر مجھے ایسا لگا جیسے اُس اسلام کی ترویج کی کوشش کی جا رہی ہو جو مغرب کے لیے تو قابل قبول ہو مگر اُس کا اُس اسلام سے تعلق نہ ہو جو ہم تک اللہ کی کتاب اور سنتِ رسولؐ کے ذریعہ پہنچا اور جس کا عملی نمونہ ہمارے سامنے ریاستِ مدینہ کی شکل میں اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت میں نظر آیا۔ تشریعی مسائل پر تو ان صاحب کو علمائے کرام ہی جواب دے سکتے ہیں' مگر ایک عام مسلمان اور قاری کی حیثیت سے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان صاحب کی ہر دلیل اور ہر نقطہ اسلامی ریاست اور اسلامی نظام کے نفاذ کی نفی کرتا ہو۔ ان کا ماننا ہے کہ جمہوریت اور پارلیمنٹ سے بالاتر کوئی نہیں' مگر جہاں اسلام کے نفاذ کی بات آتی ہے تو وہ اپنی اسی تحریر میں جمہوریت اور پارلیمنٹ کے فیصلوں کو ماننے سے انکاری ہیں۔ وہ دینی علوم کے ماہرین کے حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ یہ حق یقیناً رکھتے ہیں کہ اپنی تشریحات پیش کریں اور اپنی آراء کا اظہار کریں' مگر ان کے موقف کو لوگوں کے لیے واجب الاطاعت قانون کی حیثیت اسی وقت حاصل ہو گی جب عوام کے منتخب نمائندوں کی اکثریت اسے قبول کر لے گی..... ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اسی (پارلیمنٹ) کا ہوتا ہے اور اسی کا ہونا چاہیے..... علماء ہوں یا ریاست کی عدلیہ' پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔ 'امرھم شوری بینھم' کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے

> باوجود عملاً اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے' اس سے ہٹ کر جو حکومت کی جائے گی' وہ ایک ناجائز حکومت ہو گی' خواہ اس کے سربراہ کی پیشانی پر سجدوں کے نشان ہوں یا اسے امیر المومنین کے لقب سے نوازا جائے۔''

چلیں ایک لمحہ کے لیے ان کے تصورِ اسلام اور جمہوریت پر ہی بات کر لیتے ہیں اور یہ بھی کہ جمہوریت میں پارلیمنٹ ہی کو اصل فیصلوں کا حق ہے جس کے سامنے بقول ان صاحب کے سب کو سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے۔ اگر یہ سچ ہے تو ان سے میرا سوال ہے کہ وہ اپنے اسی مضمون کو پڑھ لیں اور اس بات کا جواب دیں کہ وہ پاکستان کی پارلیمنٹ کے فیصلوں کو ماننے سے کیوں انکاری ہیں؟ اگر پارلیمنٹ ہی کو ہر چیز پر فوقیت ہے تو پھر آپ نے اپنی تحریر میں پاکستان کے آئین کی اسلامی دفعات اور قراردادِ مقاصد کے بارے میں یہ کیوں لکھا:

> ''یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اس کو بھی کسی قرارداد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔''

ایسا کیوں ہے کہ آپ کو پاکستان کی پارلیمنٹ کا یہ فیصلہ بھی قبول نہیں کہ ہمارا ریاستی مذہب اسلام ہے! پاکستان کا آئین مدرسوں کے طالب علموں نے بنایا اور نہ ہی مولانا حضرات نے' بلکہ پاکستان کے سیاستدانوں نے اس ملک کو متفقہ اسلامی آئین دیا جو اُس خواب کی تعبیر ہے جو شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے دیکھا اور جس کا قائداعظم محمد علی جناح نے وعدہ کیا تھا۔ ان صاحب کو نجانے قراردادِ مقاصد سے کیوں اختلاف ہے جو پارلیمنٹ کا فیصلہ ہے اور جو اس بات کا اقرار اور عہد کرتا ہے:

> ''چونکہ اللہ تبارک تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار و اقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہو گا' وہ ایک مقدس امانت ہے..... جس میں جمہوریت' آزادی' مساوات' رواداری اور عدلِ عمرانی کے اصولوں پر' جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے' پوری طرح عمل کیا جائے گا' جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی حلقہ ہائے عمل میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق' جس طرح قرآن پاک اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے' ترتیب دے سکیں' جس میں قرار

واقعی انتظام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی سے اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں.....''

نجانے اس قراردادِ مقاصد میں ایسی کیا چیز ہے جو اسلام کے خلاف ہے یا جو اقلیتوں کی persecution کی اجازت دیتی ہو اور جس پر کسی بھی مسلمان کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ تو پارلیمنٹ کا فیصلہ ہے جس کے سامنے بقول ان صاحب کے سب کو سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ اگر پارلیمنٹ نے ختم نبوت کے انکاریوں بشمول مرزائیوں (جو اپنے آپ کو قادیانی یا احمدی کہتے ہوں) کو غیر مسلم قرار دے دیا تو اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں اعتراض کیسا؟ جب آپ خود لکھتے ہیں: ''علماء ہوں یا ریاست کی عدلیہ' پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔''

ان کے اسلامی ریاست سے متعلق اعتراضات اسی مضمون میں ان کی اپنی دلیل کے سامنے ہی ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ میری ذاتی رائے میں ریاست' پارلیمنٹ' سیاست' حکومت سب کچھ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات اور ان کی مقرر کی ہوئی حدوں کے تابع ہے۔ مغربی جمہوریت کا تصور اسلام کی ضد ہے جہاں اکثریت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اللہ کے قانون کو بھی رد کر دے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ نے ہمیں جو تصورِ جمہوریت دیا اس کی یہ خوبصورتی ہے کہ اُسے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے مقرر کردہ حدوں کے اندر محدود کر دیا گیا اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ ہم میں کمی یہ ہے کہ ہم نے اس آئین کے نفاذ کے لیے وہ کوشش نہ کی جو ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ پاکستان کی اسلامی اساس جس کا اظہار ہمارا آئین کرتا ہے وہ پاکستان کو متحد کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ جہاں تک ان صاحب کا یہ کہنا ہے کہ ''اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا (جمہوریت اور پارلیمنٹ کے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا) یہی ایک جائز طریقہ ہے' اس سے ہٹ کر جو حکومت کی جائے گی' وہ ایک ناجائز حکومت ہوگی' خواہ اس کے سربراہ کی پیشانی پر سجدوں کے نشان ہوں یا اسے امیر المومنین کے لقب سے نوازا جائے۔'' تو میں اُن سے یہ سوال پوچھنے کی جسارت کروں گا کہ جنرل مشرف کی ''ناجائز'' حکومت میں جن ''اسلامی اسکالرز'' نے کسی بھی حیثیت سے خدمات انجام دیں اُن کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں؟ اللہ ہم سب کو ہدایت دے اور گمراہی سے بچائے۔ آمین!

(روزنامہ جنگ' پیر ۲۶ جنوری ۲۰۱۵ء)

❁❁❁

قرآن حکیم کی عظمت' تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

خود پڑھیں۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

رسول اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

خود پڑھیے۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org